مترجم * حجۃ الاسلام مولانا روشن علی نجفی

نام کتاب .... اسلام کے بنیادی عقائد جلد سوم
تالیف .... سید مجتبیٰ موسوی لاری مدظلہ العالی
مترجم .... حجۃ الاسلام مولانا روشن علی نجفی
تطبیق و تصحیح ...... سید ہادی رضا جعفری
ناشر .... دفتر گسترش فرہنگ اسلامی قم
کتابت ...... نصیر احمد جیلانی
تعداد .... ۳۰۰۰ (تین ہزار)
تاریخ اشاعت .... محرم الحرام سنہ ۱۴۱۰ھ
طبع .... بار اول

فہرست

تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اس کا تدارک کر دیا جائے۔

میں اپنے اس ترجمہ کو اپنے بھائی جناب تصور حسین صاحب کے نام معنون کرتا ہوں.
جن کی سرپرستی نے مجھے اس قابل بنایا کہ آج چند لفظیں لکھ سکوں۔
بارگاہ حضرت حجت عج میں اس کو پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار
روشن علی

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ الحمد للہ رب العالمین وصلوۃ والسلام علی سید الانبیاء محمد وعلی آلہ الطاہرین ۔ واللعن الدائم علی اعدائھم اجمعین ۔

امابعد ۔

"اسلام کے بنیادی عقائد" مولفہ حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین سید مجتبیٰ موسوی لاری دام ظلہ ـــــــ کا یہ تیسرا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ ایک مرتبہ یہ ترجمہ مکمل ہو چکا تھا مگر میرے گھر میں جب ایک بیشناز صاحب نے چوری کی تو تمام دیگر تراجم وا ثاث البیت کے ساتھ ساتھ یہ ترجمہ بھی لے گئے اور مجھے از سر نو محنت کرنا پڑی ۔ یہ میں نے صرف اس لئے لکھ دیا کہ اگر وہ ترجمہ چھپتا ہے تو مال مسروقہ ہے ۔ اور اگر چوری کا مقصد صرف مجھے ذاتی نقصان پہنچانا ہے تو پھر یہ ترجمہ کبھی شائع نہ ہوگا ۔

اس کتاب کا بھی عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور درحقیقت یہ میرا ترجمہ اس عربی کتاب کا ہے ، جس کا عربی نام " اصول العقائد فی الاسلام " ہے ۔ کیونکہ فارسی کتاب بھی ترجمہ کے ساتھ ساتھ چوری ہو گئی ۔ میں نے جناب مولف کو تحریر بھی کیا تھا لیکن شاید ان کے پاس بھی فارسی والی کتاب نہیں تھی ورنہ ارسال فرما دیتے ۔

کتاب کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ " یہ دیکھو کیا کہا گیا ہے ، یہ نہ دیکھو کس نے کہا ہے "

معاد کے سلسلے میں شاید اس زمانے میں اتنی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے ۔

آپ حضرات سے صرف اتنی خواہش ہے کہ کتاب میں غلطیوں کی نشاندہی ضرور فرمادیں ۔

۱

موت کی دو مختلف تصویریں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی یہ ظاہری زندگی پروردگار کا بہت قیمتی عطیہ ہے۔ اور اس کا خاتمہ باعثِ رنج و غم ہے۔ ـــــــ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ـــ انسان پسند کرے یا نہ پسند کرے ـــــ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے کچھ دن گزار کر اس کو شاہراہِ موت سے بہرحال گزرنا پڑتا ہے۔ اور موت کی وحشتناک اور تکلیف دہ صورت سے آنکھیں ملانی پڑتی ہیں۔ اور یہیں پر اس کی کتاب زندگی کا ورق، ختم ہو جاتا ہے۔

ہماری اس دنیا ـــ یعنی عالمِ فنا و عدم استقرار ـــــ میں توالد و تناسل کا چکر چلتا ہی رہتا ہے لہٰذا کسی کو یہ توقع تو کرنی ہی نہ چاہیئے کہ اس دنیا میں کسی کو ثبات و قرار ہے۔ یہاں کی ہر چیز کو ایسے راستہ پر چلنا پڑتا ہے جس کا خاتمہ موت پر ہوتا ہے، خواہ وہ چیز انسان ہو یا دوسرا موجود سب ہی کے لئے موت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مادہ کے چوکھٹے میں متحرک رہنے والی ہر چیز کو بہرحال فنا ہونا ہے۔ کیونکہ اس کے صفاتِ مشخصہ خود ہی اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ اور افق کائنات میں اس کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے، جو اس کے اختتام عمر کا اعلان کرتا ہے۔

اس لئے سب سے پہلے ہم خاتمۂ حیات کے مسئلہ پر تفصیل سے بحث کریں گے اور اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے ہر سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کریں گے۔ مثلاً پیدائش اور موت کے درمیانی حصہ ہی میں زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے؟ کیا صرف یہی زمانی وقفہ جس میں مسلسل جانے والوں کی جگہ کو آنے والے پُر کرتے رہتے ہیں " کا ہی نام زندگی ہے؟ اور کیا یہ بات صحیح

ہے کہ اس وجود ــــ جو خود ابعاد ثلاثہ ہے ۔ ــــ کے ماسوا کوئی دوسرا وجود نہیں ہے ؟ یا اس کے علاوہ بھی واقعاً ایک دائمی زندگی ہے ۔ اور اس عالم کے علاوہ بھی ایک دوسرا عالم ہے جہاں اس دنیا کے فیزیائی تشکلات جدید شکل و صورت میں بدل جاتے ہیں ۔ یعنی اس تغیر پذیر دنیا کے علاوہ بھی ایک پائدار ہدف ہے ۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ ارادۂ الٰہی تخلیق انسان صرف اس لئے کرتا ہے کہ انسان اس زمین پر مسافرانہ زندگی گزار کر ایک دوسرے عالم کی طرف کوچ کر جائے ؟

اب اگر ہم موت کی تفسیر پہلی صورت میں کریں تو زندگی آلام و مصائب کا مجموعہ ہوگی ۔ کیونکہ محض عدم و فنا کا احساس ہی انسان کو ہمیشہ خوفزدہ رکھے گا ۔ اور اس کے نشاط کو ختم کر دے گا اور اس صورت میں جو ناپسندیدہ نتائج ظہور پذیر ہوں گے ان کا کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکے گا ــــ البتہ ہم اگر موت کا تصور دوسرے نکتۂ نظر سے کریں ــــ یعنی موت کو اس طرح سوچیں جس طرح وہ انسان سوچتا ہے جو ماورائے طبیعت کا قائل ہے ۔ اور اعتقاد رکھتا ہے کہ موت قفس جسم عنصری کو توڑ کر حصول آزادی کا نام ہے ۔ اور اس تنگ و تاریک جسم سے نکل کر وسیع ترین افق میں پہنچنا اور عالم مثالی میں جانے سے عبارت ہے ــــ تو موت صرف تبدیلی قالب و لباس کا نام ہو گا ۔ اور انسان موت کے ذریعہ اس خاکی لباس کو اتار کر برزخی لباس پہن لے گا ۔ اور پھر اس مرحلے سے ترقی کر کے بلند ترین مرحلے میں پہنچ جائے گا ۔ اور پھر وہ پرواز کرتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا برزخی لباس کو بھی اتار کر ابدی لباس پہن لے گا تو ایسے شخص کی زندگی یقیناً اس تحول کا نام ہوگا جو خیر سے بھرپور ہو ۔ اور جس میں ہر شئے اپنی مخصوص صفت و حیثیت سے متصف ہوگی ۔

فرانس کے مشہور عالم ڈاکٹر کارل کہتے ہیں موت کے راز سربستہ کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے جس اضطراب و پریشانی کا بشریت شکار ہے اس کا جواب دین جو دیتا ہے وہ یقیناً اس جواب سے بہتر ہے ۔ جس کو موجودہ علم دیتا ہے ۔ کیوں کہ دین کا جواب دل لگتی

بات ہے۔[1]

پس جو لوگ موت کا مطلب صرف جسم کا فنا ہو جانا سمجھتے ہیں اور زندگی صرف اس چند روزہ حیات کو سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تو دنیا کے غم سے بڑھ کر کوئی غم نہیں۔ اور جو لوگ دنیا کو ایک قسم کا کھیل سمجھتے ہیں، جیسے بچے مختلف قسم کے کھیلوں میں مشغول رہتے ہیں اور جن کا عقیدہ ہے کہ اس عالم مادی سے کوچ کرنا ایک نہایت بلند عالم کی طرف عروج و ترقی کرنا ہے ان کے نزدیک صورت حال بالکل بدلی ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک صرف یہی نہیں ہے کہ ہر وقت موت کی وحشتناک صورت ان کی نظروں میں ہوتی ہے اور بس بلکہ وہ حضرات موت کے عاشق ہوتے ہیں۔ اور ان کی ساری کوشش اس بات کی ہوتی ہے کہ وہ اس جسم فانی سے آزادی حاصل کر کے خداوند عالم سے وصال حاصل کریں۔ موت کے سلسلے میں ایسا نظریہ انسان کو شجاعت اور قربانی پر آمادہ کرتا ہے۔ اور انسان چاہتا ہے کہ ایسے پاکیزہ مقاصد کے لئے اپنی جان قربان کر دے تاکہ وہ اس قید و بند سے آزاد ہو سکے۔ اور ایسا ہی آدمی اس میدان میں جنگ و قتال کر سکتا ہے۔ جہاں خون کی ندیاں بہہ رہی ہوں اور ایسا ہی آدمی "موت احمر" کو ترجیح دیتا ہے اور اپنی خواہشات کو صرف اس لئے قربان کر دیتا ہے تاکہ آنے والے کل میں وہ سرخ رو ہو سکے۔

انسان ایسا اقدام کیوں کرتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نکتہ نظر سے انسانی زندگی کی دو حدیں ہیں۔ ایک مادی جہاں[2] انسان اجتماعی ضرورتوں کے دائرہ میں رہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ دوسری روحی و معنوی ہے جہاں انسان فکر و نظر سے کام لیتا ہے۔ اور اپنی آرزوؤں کے حصول کی کوشش کرتا ہے، اور

---

[1] راہ و رسم زندگی ص ۱۴۲

بڑی شدومد سے اس کو وجود میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور وہ اپنی ہمت وارادہ سے معاشرہ ہی کو نہیں تاریخ کو بھی بدل دیتا ہے۔

ان اسباب میں سے جو موت کو ڈراؤنی اور خوفناک صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ایک سبب یہی ہے کہ اس کی صحیح معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ مروی ہے کہ امام علی النقی علیہ السلام ایک مرتبہ اپنے ایک مریض صحابی کے پاس تشریف لے گئے دیکھا تو وہ شخص رو رہا ہے اور موت سے بہت خوفزدہ ہے۔ تو امام (ع) نے فرمایا: اے خدا کے بندے تو موت سے صرف اس لئے ڈر رہا ہے کہ تجھے موت کی معرفت حاصل نہیں ہے! یہ بتاؤ اگر تم بہت میلے اور گندے ہو گئے ہو گندگی اور میل کا یہ عالم ہو کہ تم کو اس سے شدید تکلیف ہو رہی ہو اور اس کے ساتھ تمہارے جسم میں پھوڑے اور خارش بھی پیدا ہو جائے اور تم کو یہ معلوم ہو کہ اگر تم حمام میں جا کر نہا لو تو ان تمام مصیبتوں سے نجات پا جاؤ گے تو کیا تم ایسی صورت میں حمام میں جا کر غسل نہیں کرو گے؟ یا اسی طرح کثافت و گندگی پر باقی رہو گے؟ اس نے کہا فرزند رسول! میں ضرور حمام جا کر غسل کروں گا! اس وقت آپ نے فرمایا۔ بس موت کو حمام کی طرح سمجھو کہ موت سے تمہارے بقایا گناہ ختم ہو جائیں گے۔ اور گناہوں سے نجات مل جائے گی۔ موت کے بعد تم کو رنج و غم سے نجات مل جائے گی۔ اور مقامات مسرت و سرور پر پہنچ جاؤ گے۔ یہ سن کر اس شخص کو سکون ہو گیا اور خوش ہو گیا، اپنی آنکھوں کو بند کر لیا اور اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی [1]

اور جو شخص معاد کا منکر ہے وہ انسان کو صرف ایک زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ وہ انسان کو ایک ایسا موجود سمجھتا ہے جو مادہ کے چنگل میں حیران و پریشان ہے اور اس کا

---

[1] معانی الاخبار ص ۲۹۰

نظریہ یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود یہی خاکی جسم ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور سب کچھ اسی دنیائے فانی ہی ہے۔ اس نظریہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس پر رنج و غم کے بادل چھائے رہتے ہیں اور وہ اپنی زندگی کو مختلف عوامل کا بازیچہ سمجھتا ہے، کچھ عوامل تو مشہور ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر مجہول ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اسی ظلم و جور سے بھری دنیا میں گھومتا ہے اور خود کو ظلم و جور کے سامنے مجبور سمجھ کر سرنگوں ہو جاتا ہے۔ پھر آغوشِ موت میں جا پڑتا ہے۔ اور فنا کی موجوں کے سپرد اپنے کو کر دیتا ہے۔ بیشک ایسی زندگی بڑی تکلیف دہ زندگی ہے۔ اور جو بھی انسان کے بارے میں ایسا نظریہ رکھے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا اور اس کے نزدیک پورا عالم ظلم و جور سے معمور نظر آئے گا۔

وجودِ ازلی و ابدی "جو تمام موجودات کا پیدا کرنے والا ہے" سے ہر قسم کا قطع تعلق کرنے والے کا نظریہ یہی ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس شخص نے فاش غلطی کی ہے۔ لہٰذا اس کا خمیازہ بھی بھگتنا ہوگا۔ ایسے ہی اشخاص کے لئے، امراض، حرماں نصیبی، اُمیدوں سے عاجزی، مقصد تک نارسائی، مستقبل کا خوف جیسی چیزیں اسکی روح کو شکست سے دوچار کر دیتی ہیں۔

مشہور فرانسیسی عالم وکٹیور ہیگو VICTOR HUGO کہتا ہے: یہ واقعہ ہے کہ اگر انسان عدم کے بارے میں فکر کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ اس زندگی کے بعد فنا، کے علاوہ کچھ نہیں ہے تو اس کے نزدیک اس زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔! جو چیز انسانی زندگی کو خوشگوار بناتی ہے اور عمل کرنے میں نشاط و سُرور بخشتی ہے اور تعب کو سکون بخشتی ہے اور نظریات میں وسعت پیدا کرتی ہے وہ صرف عالم ابدی اور بقائے انسان کا اعتقاد ہے۔ اور یہ عقیدہ ہے کہ اے انسان تو فانی نہیں ہے، بلکہ باقی رہنے والی چیز ہے بلکہ یہ دنیا تو تیرے لحاظ سے عالم اصغر ہے اور تو عالم اکبر ہے۔ یہ دنیا تو تیرے عہدِ طفلی کا گہوارہ ہے۔ تیرے شباب کا عالم دوسرا ہے۔

عقیدۂ معاد نہ رکھنے کے احساس نے عصرِ ترقی و علم و ٹیکنالوجی کے انسان کی شخصیت کو شکست و ریز کر دیا ہے۔ اور وہ اپنی ساری کوشش حیاتِ مادی ہی میں صرف کرتا ہے۔ کیونکہ یہی

www.kitabmart.in

اس کا انتہائی مقصد ہے۔ اور اس چیز نے انسان کے سکون و قرار کو ختم کر دیا ہے۔ اور اس کو اضطراب و پریشانی کی موجوں کے سپرد کر دیا ہے۔ اسی لئے ہماری آج کی دنیا ایک ایسا میدان بن گئی ہے، جس میں انسان صرف کامیابی، طاقت اور راحت ہی کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ اور اسی کو اپنی اُخروی سعادت سمجھ بیٹھا ہے۔

اور اسی تنگ نظری کی بنا پر انسان خیال کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی خالق نہیں ہے۔ اور انسان کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کا جو جی چاہے کرے۔ اور اسی لئے دنیا خوف و قتل و غارتگری کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ اور چاروں طرف نگ میں خون ہی کی بدبو سونگھنے کو ملتی ہے۔ اور اسی تنگ نظری کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے کو نہیں پہچانتا۔ اور انسان کینہ، حسد، ایذا رسانی اور حرص کا پتلا بن گیا ہے۔ اور نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟ اور انہیں چیزوں کے سبب سے نئے نئے فلسفی مذاہب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

مشہور استاذ اور عالم کبیر "یونج" کہتا ہے: میرے پاس تمام دنیا سے جو مریض آتے ہیں جو کامیاب زندگی کے مالک ہیں۔ ان میں تیس فیصد ایسے لوگ ہیں جو عظیم الم و تکلیف کے شکار ہیں کہ یہ دنیا بیکار و بے معنی چیز ہے ___ اور صحیح بات یہی ہے کہ آج کی ٹیکنالوجی، تعلیم کا جمود، تعصب، کوتاہی اور کوتاہ نظری نے بیسویں صدی کے انسان کو دین و مذہب سے محروم کر دیا ہے۔ اسی لئے آج وہ روح کی تلاش میں ہے اور جب تک وہ دین کی طرف نہیں آئے گا اس کو سکون نصیب نہیں ہوگا۔ لادینی ہی نے حیات کے معنی کو گم کر دیا ہے لہ

لہ، کیہان عدد (۸۱۹۶)

اس دنیا کے بارے میں دو نظریے

ایسے خطرے کے مقابلے میں کوئی شخص نہیں کھڑا ہو سکتا، جہاں پر اس کی معنوی شخصیت پاش پاش ہو جائے۔ جب تک اس کو یہ یقین دین کی طرف سے اور تصدیق وحی کے ذریعہ نہ ہو جائے کہ ہمارے رنج و غم، فرح و سرور بیکار نہیں ہیں۔ اور نہ صفحۂ وجود سے یہ ختم ہونے والے ہیں۔ اور یہ یقین نہ ہو جائے کہ ہم عدم کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ بلکہ اقدس الٰہی کی طرف ہماری حرکت ہے۔ اور یہی یقین ـــــــ یعنی اس بات کا یقین کہ ہم اس زمین پر یوم البعث تک وقتی طور سے ہیں۔ اور جب یوم المعاد ہوگا تو حشر کے لیے ہمیں اپنی قبروں سے اٹھنا ہوگا۔ اور زمین کی تنگی سے ابدی وسعت کی طرف منتقل ہو کر رحمتِ حق و الطاف الٰہی کی مجاورت نصیب ہوگی ـــــــ ہمیں ہر خطرہ سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اور یہی وجود پروردگار کا عقیدہ اور اس پر ایمانِ محکم ہی انسان کو عظمت و کرامت عطا کرتا ہے اور یہی چیز اس کو ایک منبد صیاغت میں ڈھال دیتی ہے۔ اور اگر یہی یقین و عقیدہ نہ ہو تو فطرت کی تمام گلکاریاں اور اس کے سربستہ راز بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور جس کو یہ نعمت حاصل ہو جاتی ہے اس کا نفس معتبر اور دل مطمئن ہو جاتا ہے۔

فرانسیسی مفکر جان بدن ـــــــ JEAN BODEN ـــــــ کہتا ہے

جب انسان اپنے افکار کا تصفیہ کرنے بیٹھتا ہے اور ان خواہشات سے جو اس کی روح کو اذیت پہنچاتی ہیں الگ ہو کر مادی امور سے بلند ہو کر فطرت کے جمال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، تو نباتات اور مصادرِ فطرت کو دیکھ کر اور ان کی رنگا رنگی میں غور کر کے لذت و سرور حاصل کرتا ہے۔ اس کے کیفیات و اشکال کو دیکھتا ہے اور اس کے اتصال و انفصال اور علت و معلول کے تسلسل

وعلاقات کی طرف متوجہ ہو کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ اور یہ علت ومعلول کا رابطہ فطرت کی ہر چیز میں موجود ہے۔

اور جب اس پہلی منزل سے گذر جاتا ہے تو پھر فکر وخیال کے بازوؤں کے سہارے آسمان میں پرواز کرتا ہے۔ تاکہ اجرام سماوی کے جلال وجمال وعظمت کا ادراک کر سکے۔ چنانچہ آسمانوں کی ہیبتناک حرکات اور ان کے درمیان عظیم فاصلوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور خاموشی کے ساتھ ان نغموں کو سنتا ہے جو اطرافِ عالم کی طرف سے بلند ہوتے ہیں۔

اور یہاں پہنچ کر اس کا پورا وجود ایک عمیق لذت میں غرق ہو جاتا ہے۔ اور اس علتِ اولیٰ اور خالق مبدع تک پہنچنے کا شوق بھڑک اٹھتا ہے۔ جس نے اس کے دل میں جمال کے اس چشمہ کو خلق کیا ہے۔ لیکن جب وہ جان لیتا ہے کہ اس علت کی قدرت وعقل واحساس وقوت غیر متناہی ہے۔ اور اس کا احاطہ ناممکن ہے تو اس کا نفس ٹھہر جاتا ہے اور اس کے دل کو سکون نصیب ہو جاتا ہے۔[1]

جب کسی انسان کو یہ معرفت حاصل ہو جائے کہ دنیا تو جائے امتحان ہے اور آخرت دار قرار ہے اور جسم خواہشات کے اظہار کا وسیلہ اور نفاذِ عمل کا واسطہ ہے تو پھر اس فرد کی انسانیت کسی تنگ گوشے میں منحصر نہیں ہوا کرتی بلکہ وہ تو وسیع آفاق میں پرواز کرنے لگتی ہے۔ اور ایک بلند مکان تک پہنچ جاتی ہے۔ اور ایسے شخص نے واقعاً زندگی کے مفہوم کو پالیا ہے۔

اور اگر ہم یہ طے کرنے کے لئے بیٹھیں کہ استقرار اجتماعی اور خیانت وقانون شکنی اور اسبابِ فساد کو جڑ سے ختم کر دینے میں الایمان بالآخرۃ کتنا اثر انداز ہوتا ہے۔ تو ہم اسی نتیجہ تک پہنچیں

---

[1] خداوندان اندیشہ سیاسی ج ۲ - ص ۷۵

گے کہ عقیدۂ معاد ہی ایک ایسی قوت ہے جو تنہا انسان کے سرکش نفس کو جرائم کے ارتکاب اور آلودگی گناہ سے روک سکتی ہے۔ اور یہی ایک ایسی زرہ ہے جو خواہشات کے حملوں سے انسان کو بچا سکتی ہے، اور جس میں یہ عقیدہ ہوگا وہ بغیر کسی ریاکاری کے ان صحیح اخلاقی قدروں کی پیروی کرے گا، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور بغیر کسی خارجی دباؤ کے محض ضمیر کی آواز پر ان اقدار کے نفاذ کی بھی کوشش کرے گا۔

اور معیار ثقافت و اقتصاد اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہو یا قانونی وسیع متعدد مؤسسات ہوں ان میں سے کوئی بھی تنہا ہمارے مقصد کو پورا نہیں کرسکتا۔ اور نہ ہی کوئی معاشرہ ایک معتدل و حقیقی وضع میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

آج ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ثروت مند ملکوں میں بے دینی اور ظلم و فساد کا ایک طوفان ثقافت و اقتصاد کے نام پہ برپا ہے۔ جس میں روز افزوں زیادتی ہورہی ہے۔ حالانکہ ان ممالک کے پاس ایک منظم ساز و سامان سے لیس پولیس کا نظام موجود ہے اور علم و صنعت کا انقلاب برپا ہے اور ان چیزوں نے مختلف اجتماعی قوتوں پر حکومت کی گرفت کو مضبوط کردیا ہے ــــــــ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ ممالک نہ تو سرکش نفس کی لگام پکڑ سکے اور نہ تخریب کاری و انحراف پر کنٹرول حاصل کر سکے، بلکہ فساد و تخریب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوگیا۔ اور ان تخریب کاروں نے جدید اسلحہ اور باریک نظام کو بھی چیلنج کردیا۔ اور یہ پورے کا پورا نظام اس ایمان باللہ ویقین بالآخرۃ کی جگہ نہ لے سکا۔ جس نے تہذیب نفوس اور تخریب کاری و فساد کو ختم کردیا تھا۔

اور اس زمانہ میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے جو معاشرہ پہ چھائی ہوئی فضا کو ختم کرکے معاشرہ کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں مگر وہ لوگ معاشرہ کی کیا اصلاح کرتے خود ہی اس کی چکی میں پس گئے۔ اور معاشرہ کو مستحسن نہ بنا سکے۔ بلکہ یہ لوگ تو مستقبل میں اپنے انجام کی بھی

تشخیص نہیں کر سکے۔

ظاہر ہے کہ جس معاشرہ پر بیمار ثقافت کی حکمرانی ہوگی وہ پستیوں اور رنج آوراُمور سے پُر ہوگی۔ اور بیمار ثقافت ہدف ومقصد کو ناپید کر دیتی ہے۔ اور بیکار زندگی کا عادی بنا دیتی ہے۔ اور سب سے بڑی علامت اس ثقافت کی فکری بربادی ہے۔ اور ان اضطرابات کے دُور کرنے کے لیئے جو اس میدان میں پھوٹ پڑتے ہیں۔ تمام حل بے فائدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

پس اس جدید علم نے علاوہ اس کے کہ انسان کو بہت سے میدانوں سے دُور کر دیا۔ اور پوری انسانیت پر اپنا اثر ڈال دیا۔ اس کے باوجود انسان کے لئے صرف اتنا مفید ہے کہ جس سے صحیح عقیدہ حاصل ہو سکے۔ اور صحیح عقیدہ سے جتنا دور ہوگا اتنا ہی مضر ہے۔ کیونکہ انسان ہمیشہ اپنے علوم سے صحیح منطقی نتائج نہیں حاصل کر پاتا۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم حضارۃ علمی کو مفید و نتیجہ بخش دیکھنا چاہیں تو اس ایمان حقیقی کا اشارہ ضروری ہے۔ جو ایمان علمی و ثقافتی نمو کے مقابلہ میں منتقل ہوتا ہے۔

ہماری اس دنیا میں جہاں احیائے فضائل کی ضرورت کا احساس وشعور ہمارے اندر ہوتا ہے کیونکہ انسانی طاقتیں دنیاوی متاع کے مقابلے میں معرضِ امتحان میں آ جاتی ہیں۔ اس لئے احیائے فضائل ضروری ہیں۔ اور یہی ایمان بالآخرۃ اس شخص کے افق میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ اور اس کے اخلاق میں ایسا تحول و تبدل پیدا کرتا ہے جیسے موجیں ایک دوسرے کے پیچھے ہوتی ہیں۔ اور پھر وہ اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنی خواہشات و لالچ پر خود کنٹرول کر لیتا ہے اور ان خواہشات سے پیدا ہونے والی برائیوں کی آگ کو خاموش کر دیتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے وسیع میدان میں منتشر فوائد پر کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ اور اپنے تمام امکانات اور قوتوں پر خود حکومت کرنے لگتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بلند ترین جہاد کا منتظر رہتا ہے۔ اور استغلال مادی کے سلسلہ میں غیر معقول اسباب سے اپنے نفس کو روک لیتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کو اِس

دارِ فانی میں چند دن قیام کرتا ہے۔ اور تیز رو قافلہ کی طرح اس زمین سے گزر جاتا ہے۔ اور پھر جب وہ اس جسمانی قالب کو "جو عمر فانی کا مظہر ہے" چھوڑ دیتا ہے اور زمین کی تنگ فضاء سے فرار کرتا ہے تو دوسری دنیا کے دروازے اس کے سامنے کھلے ہوتے ہیں۔ اور ایسی ایسی نعمتیں دی جاتی ہیں جن کا قیاس اس دنیا کے خیرات سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔

انسان جب تک دنیا میں رہتا ہے، تمناؤں میں گھرا رہتا ہے۔ لیکن جب وہ مومن ہو جاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس دنیا میں فرصت محدود ہے۔ نفع بہت کم ہے اور اگر دنیا حاصل بھی ہو جائے تو طویل و دائم اس کی حفاظت ناممکن ہے۔ اور حقیقی لذتیں اور خوشیاں صرف اس محدود دنیا ہی کے اندر نہیں ہیں ـــــــ تو جب وہ ان باتوں کو سمجھ لیتا ہے ـــــــ تو پے در پے خواہشات کا غلام نہیں بنتا اور زیادہ لذت و نعمت کے نہ ملنے پر رنجیدہ و غمگین نہیں ہوتا۔

اور مادی منافع کے سلسلے میں اس کا موقف اس شخص کی طرح نہیں ہوتا کہ جو مضطرب و پریشان ہو اور موت سے پہلے فاقۂ رزق سے خائف ہو۔ کیونکہ یہ دنیاوی منافع تو ان لوگوں کی نظر میں مقصود ہوتے ہیں جو دنیا کے غلام ہوتے ہیں۔ اور اس جیسے مومن کی نظر میں دنیاوی خیرات محض آخری مقصد کے حصول کے لئے وسیلہ ہوتے ہیں۔

ان چیزوں کے علاوہ دنیاوی چیزوں کا استغنا غفلت و لاپروائی سے کرنا انسان کو مستقل بنا دیتا ہے۔ اور اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موازینِ دینیہ کے سایہ میں حاصل ہونے والی لذتِ حیات یہ سکونِ نفس ایک اور لذت کا اضافہ کرتا ہے۔

جان جیکس روسو JEAN JACQUES ROUSSEAU ـــــــ کہتا ہے:

میں جانتا ہوں کہ فنا کی طرف رواں دواں ہوں۔ لیکن اس کے باوجود نہ معلوم کیوں اس دنیا سے تعلقات قائم کرتا رہتا ہوں؟ اس دنیا کی ہر شئے تغیر پذیر ہے۔ اور بادل کی سی سرعت کے ساتھ گزر جانے والی ہے۔ اور خود میرا دور بھی بہت جلد گزر جائے گا۔ تو پھر اشیائے عالم سے تعلقات مجھے کیا فائدہ

پہنچا ئیں گے ؟ اے میرے لال (ڈامیل) اگر میں تمہیں گم کر دوں تو پھر اس وقت میری بقا کا کیا مطلب ہے ؟ لیکن اس کے باوجود میں اپنے نفس کو اس حادثہ کے لئے تیار کرتا ہوں کیونکہ کوئی بھی مطمئن نہیں رہ سکتا۔ اس کے علاوہ (یہ بھی تو ہو سکتا ہے) کہ میں تم سے پہلے کوچ کر جاؤں ________ لہٰذا اگر تم سعید زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو اپنا دل ان خوبصورت چیزوں میں لگاؤ جو فنا ہونے والی نہیں ہیں۔ اور اپنی پوری کوشش اس بات پر صرف کرو کہ تمہاری خواہشات محدود ہوں۔ اور تمہارے واجبات تمام چیزوں پر مقدم ہوں اور صرف ان امور کو تلاش کرو جو قانون اخلاق کے مخالف نہ ہوں۔ اور اپنے نفس کو اس چیز کا عادی بناؤ کہ چاہے جیسی بھی شے تم سے گم ہو جائے تو اس پر رنجیدہ نہ ہو اور کسی بھی شئے کو اس وقت تک قبول نہ کرو جب تک تمہارا ضمیر اس پر مطمئن نہ ہو جائے۔ اگر ایسا کرو گے تو سعید ہو گے اور پھر زمین کی چیزوں سے تمہارا تعلق کبھی بھی بہت شدید نہ ہو گا۔[1]

البتہ جب روح انسان پر ایمان بالحق کا فیضان ہوتا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتی ہے کہ اس کو دوام مل گیا اور اس روح کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر مزید قوت پیدا ہو گئی اور عجیب و غریب قدرت کی مالک ہو گئی۔ اور پھر اسے اشیاء میں وہ زمینی غیر مستقر اقدار سے تعلق پیدا کرنے کی محتاج نہیں رہی۔ تو وہ اپنے کو مستغنی سمجھتی ہے۔ اور درحقیقت وہ روح کائنات کی مالک ہو جاتی ہے۔ اور اس کائنات کے فریب و شبہہ مظاہر اور خواہشات نفس اسے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اسی لیے جب وہ کسی نقص یا تکلیف وہ حادثہ میں مبتلا ہوتی ہے۔ تو زیادہ نہیں کرتی۔ اور کسی کامیابی سے حد چار اور خوش کنندہ امر سے متاثر ہو کر دھوکا نہیں کھاتی اور نہ ہی اپنی ذات کی بندگی اختیار کرتی ہے۔ اور تمام وہ چیزیں جو دوسروں کو ہلاک کر دینے پر آمادہ کرتی ہیں اس کے اندر کوئی غیر مستحسن اثر نہیں پیدا کر پاتیں۔

اصل معاد پر ایمان رکھنے والے انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے۔ کہ اس کو یہ شعور ہو جاتا ہے کہ اس کے مستقبل کا دارومدار اس دنیا میں صرف کیفیت اعمال پر ہوتا

---

[1] ایمل: فارسی ترجمہ سے منقول ص ۵۴۷

ہے ۔ اسی لئے اس کے اعمال بے ریا اور سچے ہوتے ہیں ۔ ان میں کسی قسم کی کھوٹ نہیں ہوتی
اور اس قسم کا عقیدہ نہ صرف یہ کہ کیفیت کے لحاظ سے عمل کو بلند کرتا ہے بلکہ کمیت میں بھی اضافہ کر دیتا ہے ۔ اب اس عقیدہ کا معتقد جتنا مستحکم ہو گا اسی قدر خلوص اعلیٰ و ارفع ہو گا اور آخر میں یہ ہو جائے گا کہ اس کی کوئی حرکت نیتِ خالص کے دائرہ سے باہر ہی نہیں ہو گی۔

ایسے شخص کو یہ احساس رہتا ہے کہ اس کے ہر عمل کی شدید نگرانی ہوتی ہے ۔ اور وہ جو بھی عمل اچھا یا بُرا کرے گا ، اس کو نامۂ اعمال میں اس لئے محفوظ کیا جائے گا ، تاکہ یوم الحساب اس پر وقت سے نگاہ کی جائے تو ظاہر ہے کہ نامۂ عمل میں سے کوئی چیز چھوٹی نہ ہو گی ۔

اس کے برخلاف جو یوم آخر پر یقین نہ رکھتا ہو گا تو سچی سے سچی چیزوں کو شکی نگاہ سے دیکھے گا ۔ کیونکہ اس کا نظریہ یہ ہے کہ نظامِ وجود میں اس کے اعمال کا کوئی بھی حساب نہ ہو گا ۔ مثلاً اگر آج وہ آگ روشن کرتا ہے تو اس کا عقیدہ ہے کہ کل یہ آگ اس کے دامن کو ہرگز نہیں جلا سکتی ۔ اسی طرح آج اگر وہ کوئی فساد کرتا ہے تو مستقبل میں کوئی بُرا نتیجہ اس کے لئے نہیں ہو گا ۔ ایسا شخص اوہام کے سمندر میں رہتا ہے اور اس کے چاروں طرف خطاؤں کی موجیں بلند ہوتی ہیں ۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ برائیوں کو دیکھتی ہیں اور وہ خود قیمتی نفسانی فضائل کو ایک ایسی نظر سے دیکھتا ہے جس میں روح نہیں ہوتی ۔ حد یہ ہے کہ اگر وہ کوئی عظیم عمل کرے بھی تو ۔۔۔۔ اس کے نظریہ کے مطابق ۔۔۔۔۔ وہ اندھا مستقبل جس کا کوئی مقصد نہ ہو اس کی قدر و منزلت کو سمجھ بھی نہیں سکتا ۔ اسی لیے ایسا شخص فضائل اور عاطفی امور کے مدِ مقابل لاپروائی کا موقف اختیار کرتا ہے ۔

یہی صورت جرائم و خیانت کے سلسلہ میں ہوتی ہے ۔ کیونکہ جب تک وہ مقرراتِ اجتماعیہ کے جال میں نہیں پھنسے گا ۔ اس کو احساس بھی نہیں ہو گا کہ کوئی ایسی ذات بھی ہے جو اس کے جرائم و انحرافات کا محاسبہ کرے گی اور اعمالِ بد کی قرار واقعی سزا دے گی ۔

بشری قوانین کا سیاسی نقص اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ کیونکہ ان کا نعرہ یہی ہے کہ موت

کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے تمام امور اکثریت کی رغبت و خواہش کی بنیاد پر انجام دیتا ہے۔ لیکن آسمانی شریعت کا نظریہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ انسانی زندگی دائمی ہے، جو موت سے ختم نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے آسمانی شریعتیں اپنے جن پروگرام کا اعلان کرتی ہیں، وہ فکر سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ وجود انسان کے اندر الجاؤ رفیقہ کے ڈھالنے میں اور بنیادی تغیرات ایجاد کرنے میں جو کام دین کرتا ہے وہ بشری علم و فکر ہرگز ہرگز نہیں کر سکتی۔ لوگوں کے ابتذال کے گڑھے میں گرنے اور اجتماعی اضطرابات کے وجود کا سبب یہی فکری نقص ہے اور ان قوانین کا انسانی فطرت کی گہرائی سے عدم ہم آہنگی اس کا سبب ہے۔

اور اسی بنا پر دیندار انسان انہیں مقررات کو نافذ کرتا ہے جن کے بارے میں ایمان لا چکا ہے کہ یہ دائمی حکم ہے اور وہ زمانہ سے بے نیاز ہو کر عالم باقی کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اور ایسے انسان کو محدود بشری علم کی عینک سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ وہ اس سے کہیں بلند و برتر ہے۔

بعث (قیامت) حکمتِ الٰہیہ کا جُزو ہے

یہ بات طے شدہ ہے کہ انسانی حرکات باطنی خواہشات کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ مختلف چیزوں کے لئے ہماری کوششیں، ہماری خواہشات و نیتوں کی غمازی کرتی ہیں۔ بلکہ اگر کبھی ہم کو یہ خیال آئے کہ ہمارے بعض ارادی و اختیاری اعمال بغیر کسی غرض کے بھی ہوتے ہیں تو یہ صرف غلط فہمی ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے تمام اعمال کسی نہ کسی پوشیدہ غرض کے ماتحت ہوتے ہیں۔ چاہے فعلاً ہم کو اس کا شعور نہ ہو —————— مثلاً ہم کہتے ہیں بلند ہمت ہوں اور عالی ہمت ہوں۔ اور اس بلند ہمتی کی بنا پر یہ سوچنے لگیں کہ دوسروں کے ساتھ ہم جو احسان کرتے ہیں وہ محض انسانی ہمدردی اور سکونِ قلب کے لئے ہوتا ہے، ہماری کوئی غرض نہیں ہوتی۔ تو یہ بھی اشتباہ ہے کیونکہ درحقیقت اس کے پس پردہ بھی ایک مقصد ہے

یعنی اپنے اطمینان اور اپنے سکونِ قلب کے لئے یہ اعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح میدانِ فطرت میں کوئی بھی عامل بیہودہ ہدف و غایت سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ بس صرف ایک فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ علم و معرفت کے زیرِ سایہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے۔ نظامِ وجود میں اس کا خالق فطری عامل ہوتا ہے۔ جس کا علم و معرفت سے کوئی ارتباط نہیں ہوا کرتا۔ لیکن در حقیقت دونوں جگہوں پر ہدف و غایت کے لحاظ سے معاملہ مساوی ہی ہوتا ہے ——— آزاد عقل اس بات کو درک کر لیتی ہے کہ نظامِ وجود کی بنیاد ایک ایسے موجود عالم کامل کی ترتیب پر ہے جو اپنے انجام کا خود حاکم ہے۔ اور طبائع جس چیز میں اسے محصور کرنا چاہتی ہیں وہ ان کی حدود سے باہر ہے۔ اور وہ حکمتِ عقلی و ہدایتِ اختیاری کے افق تک بلندی حاصل کرتا ہے اور بلند ہو جاتا ہے وہ اپنے لئے ترقی یا تنزل کا راستہ خود اختیار کرتا ہے۔

اس کے علاوہ جب ہم کو یہ علم ہوتا ہے کہ یہ عالم جو بہت ہی منظم و محدود قوانین و باریک بینی پر مشتمل ہے اور جو چھوٹے سے مچھر کے پروں، ریت کے باریک ذرّوں، خوبصورت درخت کے پتوں سے لے کر ایسی کہکشاؤں پر مشتمل ہے جس میں کئی کئی سورج ہیں۔ اور ایسی فضا پر مشتمل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اور اس فضا میں کتنی کہکشائیں ہیں اس کا شمار بھی ممکن نہیں ہے۔ اور جو اپنے مخصوص نظام کا تابع ہے۔ مختصر یہ کہ یہ غیر متناہی وجود جو چھوٹے سے ذرّے سے شروع ہو کر عظیم ترین اجرامِ سماوی پر مشتمل ہے تو یہ بات خود ہی عقل میں آ جاتی ہے کہ ایک باریک و محیر العقول نظام کے تحت یہ کائنات رواں دواں ہے ——— جب علومِ جدیدہ سے عالم اور اس کے قوانین کا ہم کو علم ہو گیا تو عقلِ انسانی اور علمِ بشری یہ ماننے پر ہرگز تیار نہیں ہوگا کہ یہ ساری کوششیں بے فائدہ ہیں اور فعل و فاعل و ہدف کے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔

یہ فرض کر لینے کے بعد اس محیر العقول نظام کا خالق غیر متناہی علم اور غیر محدود قدرت کا مالک ہے۔ یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ زندہ و مردہ موجودات کے اندر جو باریک قوانین ہیں۔ وہ سب بے مقصد ہیں۔

توحیدی معاشرہ جو خدا کو مختلف کمالات کا مالک سمجھتا ہے، وہ خود اس بات کا مؤید ہے

کہ اس نظام کا کوئی واقعی مقصد ہے۔

اور جب ہم خدا کے لامتناہی علم اور غیر محدود قدرت و دانش و حکمت کا اعتراف کرتے ہیں، تو پھر خدا کے افعال میں ہدف خالی کی نفی کیونکر ممکن ہے؟

بھلا یہ بات کوئی مان سکتا ہے کہ جب ہر ہر عضو بدن کے اندر ایک مخصوص ہدف موجود ہے لیکن پورے انسان کا کوئی ہدف و مقصد نہیں ہے۔ جبکہ ہم خود بھی دیکھ رہے ہیں کہ انعقاد نطفہ سے کر پختہ کاری کی منزل تک وہ خود مطلق العنان نہیں ہے بلکہ قوانین فطرت کے ایک مخصوص نظام کے تابع ہے۔ اور صرف دنیاوی زندگی کے اسباب کی فراوانی ہی اس کے لئے کافی نہیں ہے۔

بہر حال آسمانی شریعتوں کی دعوتِ مسئولیت اور تکلیف کی بنیاد پر تھی۔ اور انبیاء کرام مسلسل اور یقین کے ساتھ یہ اعلان کرتے رہے کہ عالم آخرت میں ہر شخص کے اعمال کا حساب کیا جائے گا اور یہ حضرات ہمیشہ اپنے ماننے والوں کو اس جدید مرحلہ اور دوسری زندگی سے ڈراتے رہے تاکہ اپنے نفسوں کو آمادہ کریں اور جو کچھ بھی عمل خیر آخرت کے لئے ممکن ہو اس کو کر ڈالیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جو ان کی دوسری زندگی کو شقاوت و بدبختی کی آماجگاہ بنادے۔ اور وہ ہمیشہ حسرت و ندامت کی آگ میں جلتے رہیں۔ کیونکہ دوسری زندگی کے بیج انسان اپنے ہاتھوں اسی دنیا میں بوتا ہے۔ اور اسی زندگی کے اعمال خیر دوسری زندگی میں کام آنے والے ہیں اور یہ طے شدہ بات ہے کہ حیات ابدی میں آدمی وہی کاٹے گا جو یہاں بو چکا ہے۔

اگر ایک بہترین فنکار اپنا بہت زیادہ وقت دے کر ایک بے مثال تصویر بنائے اور پھر اسے پھاڑ ڈالے تو کیا ایسا شخص سلیم العقل کہلائے گا؟

ظاہر ہے کہ کوئی باشعور انسان ایسا کوئی اقدام نہیں کرے گا جو بے مقصد ہو۔

پس کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ اس عظیم کائنات کی خلقت اور خصوصاً اس کائنات میں انسان کی تخلیق کا مقصد صرف یہی محدود زندگی ہو تو جو متضاد چیزوں سے بھرپور ہے؟

اور کیا انسان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی اندھی خواہشات اور خواب و خیال میں ڈوبا رہے اور اس کی ذات سے پیدا ہونے والے باطل میلانوں میں گرفتار رہے۔ پھر موت کے ذریعہ اس

کی زندگی کی کتاب کا ورق الٹ دیا جائے۔ اور وہ غیر متناہی فضا میں غبار کے ذروں کی طرح بکھر جائیں اور بس؟ کیا ایسا اقدام بے کار تصویر بنانے والے کا سا نہیں ہے! اور کیا یہ بات اس ذاتِ خالق کے مناسب ہے جس نے اس عظیم وجود کے ہر ہر ذرہ کے ظاہر و باطن میں اپنی حکمت بھر دی ہے؟ یقیناً اس قسم کی حکمت ایسی چوڑی غیر نہیں ہو سکتی جو ارض وجود کو سیراب کر سکے۔

پس جو شخص خدا کی حکمتِ بالغہ کا عقیدہ رکھتا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس آفاقِ واسع کے اندر کسی بھی شئے کا بے نظام ہونا غیر ممکن ہے بلکہ اس عالم کا نظام عدالت و حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے۔ اور اس کائنات کی ہر چیز ایسے نظام کی تابع ہے جس میں کوئی خلل نہیں ہے۔ اور اگر انحراف عن القانون عام ہوتا اور چیزوں کا وجود غلطی پر قائم ہوتا تو اس کائنات کے اندر انجام کا اثر بھی نہ ہوتا۔

غلاصہ جب انسان وجود کا یہ تصور رکھے گا تو محض اس دنیا کے ختم ہو جانے کی وجہ سے وجود انسانی کے تمام ابعاد پر عدم کا حکم نہیں لگا سکے گا۔ اور اس نظریے کی بنا پر عمیق و معدہ شکل میں نظامِ وجود کا مستمر رہنا ممکن ہے۔ اور یہی نظریہ انسان کی بلند امیدوں کی پیاس بجھا سکتا ہے۔ قرآن صریحی طور سے اعلان کر رہا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا" (ص ۳۸ آیت ۲۷)

ہم نے زمین و آسمان کو اور ان دونوں کے درمیان کوئی باطل چیز نہیں پیدا کی۔

ہاں ذاتِ پروردگار ہر جہت سے کامل ہے۔ نقص و احتیاج کی وہاں تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ بلکہ یہی موجودہ مخلوقات اپنے تمام حالات میں اس ذات کی محتاج ہیں۔ جب خدا نے انسان کو نعمتِ حیات اور قوتیں بخشی ہیں اس کی طرف تمام مخلوقات کا پلٹنا قرار دیا ہے۔ ارشاد رب العزت ہے: يَآأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (سورۃ فاطر آیت ۱۵) اے لوگو! تم ہی خدا کے محتاج ہو خدا تو غنی و حمید ہے۔

اور حکمتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ ایک ایسا دن مقرر ہو جس میں لوگوں کا حساب لیا جائے

جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ (سورہ الحجر، آیت ۲۵) تمہارا خدا لوگوں کو محشور کرے گا، یقیناً وہ حکمت والا اور جاننے والا ہے۔

لہٰذا وہ کمال جو انسان کے شایانِ شان ہو اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی امیدیں عالم آخرت میں پوری ہوں گی۔ قرآن کہتا ہے: يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۔ (سورہ انشقاق آیت ۶) اے انسان طاعتِ حق کے راستہ میں ہر طرح کی کوشش کر، انجام کار حضور پروردگار میں جائے گا۔ اور (موت) کے ذریعہ اس سے ملاقات کرے گا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وَ اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (سورہ نجم آیت ۴۲) یقیناً تیرے رب ہی کی طرف انتہا ہے۔

درحقیقت انسان ہی دینی، اخلاقی، بلند الٰہی اسباب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور یہی انسان مادی بیڑیوں کو بھی توڑ سکتا ہے، جو اس کی روح کو گرفتار کرنا چاہتی ہیں۔ لہٰذا انسان کو اپنے مقاصد و آرزوؤں کی تکمیل کے لئے مادی زندگی اور ظاہر فریبی سے چشم پوشی کر لینی چاہئے۔

اور انسان کو یہ بنیادی تغیر قبول حاصل ہو گیا کیونکہ اس کے اعماق سے داخلی وجود کی فکر پھوٹی ہے۔ اور وہ ایسے بلند اسباب سے متمیز ہو چکا ہے جو خلود کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔ اور یہ خود ایک علامت ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک خاص استعداد اور قابلیت سے متمتع ہوا ہے۔ جو اس کو حیات ابدی کا اہل بناتی ہے۔

انسانی اعمال ایسے بیج ہیں کہ جب تک ان کا نتیجہ حیات ابدی کی صورت میں نہ ہو ان کا کوئی صحیح مفہوم ہی نہیں نکلتا۔ نیکوکار حضرات کے اعمال صالح ان کے لئے حیات سعیدہ مہیا کریں گے، جو دائمی ہوگی۔ اور فساد کرنے والے بھی اس دنیا میں اپنا بیج بوتے ہیں۔ اور ان کو بھی دائمی حیات نصیب ہوگی۔ لیکن وہ اپنے فساد کا ثمرہ وہاں حاصل کریں گے۔ اور وہ پھل بہت تلخ ہوں گے جو ان کے اعمال کے مناسب ہی ہوں گے۔

اس سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں: بے شک دنیا صرف گذرگاہ ہے اور دارالقرار تو صرف آخرت ہی ہے (شرح نہج البلاغہ - از ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۳۲۰ خطبہ ۲۰۳)

اور واقعی بات تو یہی ہے کہ آخرت کی زندگی ہی دنیاوی زندگی کے صحیح مفہوم و معنی کو بیان کرتی ہے ۔۔۔۔۔۔

بعث بھی عدل کا ایک نتیجہ ہے

عدل الٰہی کا مسئلہ بھی اہم ترین مسائل میں ہے

اس دنیا میں ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے کسی عمل کا نہ تو بدلہ ۔۔۔۔۔۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا ۔ ملتا ہے ۔ اور نہ ہی اس کا محاسبہ ہوتا ہے ۔ مجرم اور ظالم حکام جنہوں نے انسانوں کی عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے وہ اپنی عمر کے آخری حصہ تک بہترین زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے مطابق جو چاہتے ہیں کرتے رہتے ہیں ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ قانون کی گرفت میں آتے ہیں ، اور نہ عدالت ان کے خلاف کوئی حکم دیتی ہے ۔ اور نہ ہی ان کے اعمال کا فطری ردعمل ہوتا ہے ۔ اور نہ کوئی ایسی دینی طاقت ہے جو ان کو ان کے برے اعمال سے روک سکے ۔ اور دوسروں کے حقوق چھیننے پر ان کے ہاتھ کاٹ سکے ۔

اور پھر انجام یہ ہوتا ہے کہ ظالم اور مظلوم ، فسادی اور مصلح ، مجرم و پاکیزہ سب ہی اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں ۔ نہ ظالم کو یہاں ظلم کا بدلہ ملتا ہے اور نہ مظلوم کی کوئی فریاد سنتا ہے ۔

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ ظالم و کافر حکام کے سامنے سرنگوں ہونے کو اسلام روکتا ہے اور ظالم حکومتوں کی طرف سے واجب کئے گئے ناجائز احکام کو قبول کرنے کو حرام قرار دیتا ہے ۔ اور کسی بھی دینی واجب سے تجاوز کرنے کو روکتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اگر دین پر کھنے لوگ چلتے رہیں گے (مترجم) ۔۔۔۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ ظلم کے مقابلہ میں جنگ کبھی تو کامیاب ہو جاتی ہے اور کبھی ناکام ۔ اس کے علاوہ بعض مجاہد موت سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں اور ظالمین کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ۔ اب اگر تمام صالحین و ظالمین

کے نامۂ اعمال کو اسی دنیا میں بند کر دیا جائے اور سہو و نسیان کے مقبرہ میں دفن کر دیا جائے تو پھر عدل الٰہی اور اس کی حکمت اور تمام بندوں کے ساتھ لطف غیر متناہی کہاں رہا ؟

خدا عادل ہے اور تمام مظاہر وجود میں اس کی حکمت و عدل نمایاں ہے۔

اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ خدا نے ایسے بہت سے حالات پیدا کئے ہیں جن کے ماتحت ظالمین و مجرمین اپنے حسب منشا، اپنی حد تصرف کو پہنچ کر پوری زندگی بسر کر سکتے ہیں اور قوت حاصل کر لینے کے بعد بغیر کسی محاسبہ کے اپنی تمام خواہشات پر چاہے وہ کتنی ہی پست و بد ہو عمل کرتے رہتے ہیں۔ اور مظلوم بھی زندگی کی آخری گھڑی تک ظالموں کے شکنجہ کو برداشت کرتے کرتے جان دے دیتا ہے۔ اور محرومی و بدقسمتی کے انتہائی درجہ کو برداشت کرتا ہے۔ اور پھر اس کے باوجود ظالم کو ظلم کا بدلہ نہ ملے اور مظلوم کو جزا نہ ملے تو کیا یہ صریحی ظلم نہیں ہے ؟

اور اگر کوئی محبت سے لبریز دل والا اور صاحب عدالت اس قسم کے ظلم کو برداشت نہ کرے تو کیا ممکن ہے کہ ذاتِ مقدس الٰہی جو منبع رأفت و حنان ہے جس کے عدل کی انتہا نہیں ہے۔ اسکو بھی اس پر راضی کیا جا سکتا ہے؟ اب آپ ہی فرمایئے وہ فکر خلاق جو انسان کی انسانیت کو ثابت کرنے کے لئے سب سے بلند و بالا ہے۔ اور جو وجود انسان کی خصوصیات کی صحیح تعبیر کرنے والی ہے، وہ اس سلسلہ میں کیا حکم کرے گی ؟

میں یہ مانتا ہوں کہ مظلوموں پر جو ظلم ہوتا ہے اور ان کو ان کے حقوق سے جو محروم کیا جاتا ہے اس میں بلاواسطہ خدا کی کوئی شرکت نہیں ہے ——— لیکن ظالموں اور مجرموں کو آزاد چھوڑ دینا اور آخر تک ان کے اعمال کی سزا نہ دینا بھی تو خلاف عدالت ہے !

پس خدا کی عدالت اور لوگوں کا ان کے اعمال پر دقیق محاسبہ کے درمیان مضبوط ارتباط بعث کی ضرورت اور اس کے حتمی ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ اس لئے بھی بعث کی ضرورت ہے کہ بہت سے جرائم اور گناہ اتنے عظیم ہوتے ہیں کہ اس کائنات کے اندر جو کہ محدود ہے ان جرائم پر عقاب ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ عقاب کو گناہ کے مناسب ہونا چاہئے اور جب گناہ بہت عظیم ہو یا متعدد بار ہو تو اس دنیا میں

اس کا بدلہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک مجرم ہے جس کا مقصد کمزوروں کے خون کو چوسنے
کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس مجرم کی نظر میں دنیا صرف ایک جنت ہے جس سے پیٹ
بھرنا مقصود ہے۔ اور دنیا اس کے نزدیک لوٹنے اور غارت کرنے کے علاوہ کسی اور چیز کا نام نہیں
ہے۔ لہٰذا وہ روز نیا شکار کرتا ہے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ ہزاروں بے گناہوں کے خون سے
آلودہ ہیں اور وہ اپنی خواہشات کی قربان گاہ پر فوج در فوج لوگوں کو ذبح کرتا ہے۔ اور وہ ایک ایسے
گندے و بدبودار پانی میں ڈوبا ہوا ہے جہاں اس کو گذشتگان سے کوئی عبرت حاصل نہیں ہوتی اور نہ
ہی وہ اچھے اور عمدہ مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ اب اگر ان تمام جرائم کے مقابل میں اس کی
عمر چھین لی جائے جیسا کہ اس نے لاکھوں بے گناہوں کی عمریں چھینی ہیں تو یہ ایک غیر عادلانہ جزاء
ہوگی۔ کیونکہ یہ تو اس کے جرائم میں سے صرف ایک جرم کا بدلہ ہے۔ باقی جرائم و جنایات
تو بغیر حساب و کتاب کے رہ گئے۔ پس ثابت ہوا کہ بہت سے جرائم ایسے ہیں کہ اس دنیا میں
ان پر سزا ممکن نہیں ہے۔ اور اگر ہم تحصیل منطق کے ذریعہ اپنی فکروں میں مزید وسعت دیں تو
یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو مکمل طور سے تمام لوگوں کے
لوٹے ہوئے حقوق کو واپس کرا دے ـــــــــــ

اسی طرح اس دنیا میں پورا اور مکمل ثواب بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اب اگر ہم صرف ان افراد
کی ان مسلسل کوششوں اور جہاد کو دیکھیں جو اس رنج و غم اور مشکلات سے بھری ہوئی دنیا
میں انجام دیئے ہیں تو بہت آسانی سے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دنیاوی جزا چاہے کتنی بڑی ہو، ان
اعمال جلیلہ کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔

مثلاً جس شخص نے اپنے علمی خزانے سے کروڑوں افراد کو بغیر ریاکاری کے فائدہ پہنچایا ہو،
اس کے ان اعمال جلیلہ کی اس دنیا میں کیا جزا دی جا سکتی ہے؟

اسی طرح جس شخص نے اپنی پوری عمر اور تمام کوششیں عبادت الٰہی اور خدمت خلق میں
صرف کر دی ہوں اور اس کی خدمت کسی مخصوص فرقہ کے لئے نہ ہو بلکہ مختلف معاشرہ میں مختلف
قسم کی خدمات انجام دی ہوں یہاں تک کہ مقصد الٰہی کی تکمیل میں اپنی جان تک دے دی ہو اگر اب

اور کس جگہ اس کو جزا دی جائے گی! کیا اسی دنیا میں؟ یہاں تو ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی عمر اتنی لمبی ہوتی ہی نہیں کہ اس کے ایثار اور اسکی قربانیوں کی اس کو جزا دی جاتی۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ چونکہ یہ عالم محدود ہے لہٰذا صالحین و نیکوکاروں کی جزا نہیں دی جا سکتی۔

اگر ہم اس اوّل درجے کے نظام میں جو الٰہی نظام ہے اور سب ہی کو شامل ہے۔ مسلسل غور و فکر کریں اور ہر چھوٹے بڑے موجود کے بارے میں متصل ذرّہ سے لے کر اجرام سماویہ میں جن کی کوئی حد نہیں ہے۔ عمیق نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ یہ پورا نظامِ وجود ایک مکمل عدالت کے ماتحت چل رہا ہے اور اس عظیم نظام کا کوئی حصّہ عدالت سے خالی نہیں ہے۔ اور یہ عالمِ وجود کے مجموعی مظاہر سے اس حقیقت کا پتہ لگا لینا ہمارے لئے بہت آسان ہے۔

خدائی نظامِ عدل اتنا مکمل ہے کہ اس نظام کا کوئی حصہ اپنے مقرر حد سے ذرّہ برابر ہٹ جائے تو یہ پورا نظام ٹوٹ پھوٹ جائے اور یہ دنیا ختم ہو جائے۔

اس بناء پر چونکہ انسان بھی اس نظامِ کل کا ایک حصّہ ہے لہٰذا اس کے لئے یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ اس جامع اور کل نظام سے یہ مستثنیٰ ہے۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ انسان دیگر موجودات سے اپنی قوتِ ممیزہ اور حریتِ فکر کی وجہ سے الگ ہے اور اس کی قوتِ ممیزہ اتنکار اور اعمالِ خلّاقہ کا اصلی بانی ہے۔ اور وہ اسی قوت کے ذریعہ ایسے راستہ پر چلتا ہے جس سے اس کے بنیادی اغراض پورے ہو جاتے ہیں۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اپنے منتخب مقصد تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

انسان کے یہی خصوصیات اس کو فخر و گھمنڈ کبر و تکبر پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس منظم و مربوط نظامِ عالم کے مظاہر کے درمیان انسان اپنے اس امتیازِ خاص سے استفادہ کرتا ہے۔ اور معین امکانات اس کے لئے اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں کہ جن کو وہ اپنے تعمیری اعمال میں محدود کر دیتا ہے اور اعمالِ فشار کو ختم کر دیتا ہے۔ پس پروردگارِ عالم نے انسان کو آزاد پیدا کر کے نظامِ خلقت کے تمام اسباب کو عالم کے لئے ظاہر کر دیا۔ اور اسی کے ساتھ انسان میں ایسی سرشت بھی رکھی کہ وہ نافرمانی بھی کر سکتا ہے ______ اور اگر غلط انسان

کو معنوی ذخائر کے کسب پر اور خیر و سعادت کے راستہ پر چلنے کے لئے اور اس حرکت پر مجبور پیدا کرتا جو انسان کو اعلیٰ اقدار کی مالک بناتی ہیں تو پھر ان چیزوں کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوتی اس لئے ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ خدا کی طرف سے انسان کو حریت و ارادہ ملنے کا مطلب ہوا یہ ہے کہ اسے ایک نہ ایک دن عدل الٰہی کے محکمہ کے حضور حاضر کر دینا ہے۔ تاکہ نظامِ وجود کا قانونِ عام یعنی عدالت کو اس پر منطبق کیا جا سکے کیونکہ اس بات کی تصدیق ناممکن ہے کہ خدا کے اس قانونِ عدالت سے جو تمام عالمِ وجود کو شامل ہے انسان مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ ایسا تسلیم کر لینا نظامِ وجود کے انسجام میں خلل مان لینا ہے۔

لہٰذا عدالت عامہ کی بنیاد پر التفات کرتے ہوئے جو تمام اطرافِ وجود میں محسوس و مشاہد ہے اور نظر و اعتبار سے دیکھنے پر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ یہ محدود دنیا چونکہ ثواب و عقاب کی گنجائش ہی نہیں رکھتی تو فطری طور پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک دوسری دنیا ضرور ہے جہاں انسان کو اپنے کئے کی سزا یا جزا ملے گی۔

اور اس امر کی دلیل استعداد خاص ہے جس کا سراغ خلقِ انسان میں تلاش کیا جا سکتا ہے اور اس استعداد کا ڈائریکٹ نتیجہ اس کے تمام ابعاد کے نشو و نما اور تمام امیدوں کی تکمیل اور بنیادی ضرورتوں کی تامین کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اور یہیں سے ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ــــــ جس کو خلقتِ انسان کی احتیاج نہیں ہے ــــــ ایسا کبھی نہیں کر سکتا کہ انسان کو اس کے کمال لائق تک پہنچنے سے پہلے فنا کے گھاٹ اتار دے۔ اور ہر عاقل اسی نتیجے تک پہنچے گا اور اس کے ماسوا کو چھوڑ دے گا۔

یہ بات طے ہے کہ اس دنیا کے اندر تمام گنہگاروں اور مجرموں کو ان کے اعمال کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ ہاں بعض حالات میں بعض مجرموں کو اس دنیا میں بھی کچھ سزا مل جاتی ہے اور نہ صرف یہ کہ تاریخ ان پر لعنت کرتی ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے انجام کی تلخی کا مزہ چکھتے ہیں۔ اور اس دنیا میں مبتلائے عذاب ہونے کے بعد موت کے شکنجہ میں بُری طرح پھنس جاتے ہیں ــــ حالانکہ

کسی کو تصور بھی نہیں ہوتا کہ یہ ظالم ایسے عذاب میں بھی گرفتار ہو سکتا ہے!

اور یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ فساد فی الاصل اور انجام کے درمیان ہمیشہ اتفاقی طور سے علاقہ محض معتبر ہوا کرتا ہے۔ بلکہ دنیاوی جزا کے ابعاد میں سے یہ بعد بسیر معتبر ہوتا ہے: قرآن مجید میں ہے: فَأَذَاقَهُمُ اللَّهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (سورۃ الزمر آیت ۲۶) یعنی خدا نے انہیں (اسی) دنیا کے اندر رسوائی (کی لذت) چکھا دی اور آخرت کا عذاب تو یقیناً اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش! یہ لوگ (یہ بات) جانتے۔

مشہور فلسفی امرسن ـــــــــــ EMERSON ـــــــــــ کہتا ہے دنیا بمنزلہ ایک جدول ضرب یا معادلۂ ریاضیہ کے ہے، چاہے جتنا الٹ پلٹ کرو ایک ہی جواب ملے گا جس طرح ہم جب کسی ریاضی کے مسئلہ کو حل کرنے بیٹھتے ہیں تو چاہے جو طریقہ اختیار کریں نتیجہ میں ایسا عدد ملے گا جو قابل تغیر نہ ہوگا۔ اسی طرح فطرت اپنی خاموشی کے ساتھ ـــــــــــ لیکن بہت مضبوط و یقینی طور پر ـــــــــــ تمام رازوں کا پردہ فاش کر دیتی ہے اور ہر جرم کا نتیجہ بھگتنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور اچھے کام پر ثواب دیتی ہے۔ ہر ظلم کا جبران کرتی ہے۔

پس سزا ایک بنیادی ضرورت کا نام ہے، جو ہر ایک کی صورت کو اس کی حسب حیثیت ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً اگر ہم دھواں دیکھیں تو یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی آگ کا نتیجہ ہے۔ اور اگر ہم کسی ہاتھ یا پیر کو دیکھیں گے تو یقین کر لیں گے کہ یہ کسی جسم کا حصہ ہے۔ بلکہ ہر عمل کے ساتھ اس کی جزا، ایک لازم و ملزوم چیز ہے۔

ایک دوسری عبارت میں ـــــــــــ اس قانون کے مطابق جس کا ذکر کیا گیا ـــــــــــ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تکمیل نفس کے دو طریقے ہیں۔ ۱۔ فعل و انفعال کے ذریعہ خود نفس شئی میں طبیعت واقعیہ کے اندر ۲۔ طبیعت ظاہریہ کے اندر کیفیت علنیہ کے ذریعہ ـــــــــــ کیفیت علنیہ کا دوسرا نام سزا بھی ہے۔ اور سزائے ذاتی کا اثر خود نفس شئی میں ہوتا ہے۔

جو آنکھوں سے نہیں دکھائی دیتا۔ عقاب کیفر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اور یہ نفسِ شئی سے جدا
نہیں ہوتا۔ اور زیادہ تر طویل مدت تک ظاہر بھی نہیں ہوتا۔ گناہ کا وہ عذاب جو گناہ کا لازمہ ہے
کبھی مدتوں کے بعد ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے۔ کیونکہ وہ گناہ کا لازمہ ہے اور گویا ایک رسی کے
ذریعہ گناہ سے بندھا ہوا ہے۔ جبکہ جرم و سزا ایک ہی درخت کی دو ٹہنیاں ہیں اور سزا ایک
ایسا پھل ہے جو دفعتاً غنچوں سے پھوٹ پڑتا ہے۔[1]

برائیوں کا ردِ عمل ایک ایسا زندہ قانون ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ خداوندِ عالم ظلم و فساد پر ہرگز
راضی نہیں ہے۔ اور ہر فسادی کو عالم آخرت میں انصاف کے مطابق سزا ملنی ضروری ہے۔

تربیت و نصیحت کے سلسلہ میں فعال جزا کے دور کو حقیر و کمتر نہ سمجھنا چاہیئے خواہ فرد
کی تربیت ہو یا معاشرہ کی۔ اور اسی وجہ سے تعزیر کرنا اور سزا دینا رحمت و لطف کہا جاتا ہے
کیونکہ اس کا مقصد محض اصلاح ہے۔ اور یہ ایک قسم کی غرامت ہے۔ جسے انسان
ادا کرتا ہے مگر اس کے بڑے ہی قیمتی فوائد ہوتے ہیں۔

قرآن اعلان کرتا ہے: إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا
الْإِنْسَانُ (س احزاب آیت ۷۲) بے شک ہم نے (روز ازل) اپنی امانت کو سارے
آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اس (بار) اٹھانے
سے انکار کیا۔ اور اس سے ڈر گئے۔ اور آدمی نے (بے تامل) اسے اٹھا لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پس
خدا نے اپنی عدالت کو کمال تک پہنچانے کے لیے جبر کا سایہ انسان سے اٹھا لیا۔
اور جس امانت میش کو پہاڑوں نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا، اس کو جب انسان پر پیش
کیا گیا تو اس نے قبول کر لیا۔

اور یہ اس وجہ سے ہے کہ جدوجہد و عمل کے بغیر انسان سر بلند نہیں ہو سکتا، اسی لیے

---

[1] الفلسفۃ الاجتماعیۃ ص ۳۷۸ منقول از ترجمہ فارسی

ارشاد ہے، كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (س مدثر آیت ۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے۔ یعنی اس دنیا میں جو شیٔ بشکلِ تجاوز ظاہر ہوگی وہ آخرت میں بصورت عتاب ظاہر ہوگی لہٰذا معبد ازلی پر اور اس کی عدالت پر ایمان انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ خود عدالت کا التزام کرے۔

عالم الٰہی آگوسٹین AUGUSTINE کہتا ہے: انسان کے لیے سب سے افضل شیٔ یہ ہے کہ اپنی پوری عمر بغیر کسی تردد کے خدمتِ خدا میں صرف کر دے کیونکہ جو روح خدمتِ خدا میں ہوتی ہے وہی جسم پر مسلط ہوتی ہے۔ اور جو عقل خدمتِ خدا میں ہوتی ہے وہ سرکش انسانی مشاعر پر مسلط ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ کون سی عدالت کا اس انسان کے یہاں پائے جانے کا امکان ہے جو خدمتِ خدا کے بارے میں کوئی معرفت ہی نہیں رکھتا؟ کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ اس فرد کی نہ تو روح جسم پر مسلط ہو اور نہ عقل مشاعر پر مسلط ہو[1]

ان لوگوں کے نزدیک مثالی زندگی موت کے بعد والی زندگی ہے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح ہے: وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (س عنکبوت آیت ۶۴) اور یہ دنیا وی زندگی تو کھیل تماشے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے اور اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے (باقی لغو)۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ کے خاص بندے نہ صرف یہ کہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ وہ ملک الموت سے ملنے کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اور اس خوشخبری کے سننے کے لیے ان کی روح کے کان بے چین رہتے ہیں، يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (س فجر آیت ۲۷، ۲۸) (اور کچھ لوگوں سے کہے گا) اے اطمینان پانے والی جان اپنے

---

[1] ارباب الفکر السیاسی ج ۱ ص ۳۵۴ منقول از فارسی

پروردگار کی طرف چل تو اس سے خوش وہ تجھ سے راضی۔

عالم آخرت میں مقصود بالذات سعادت ہوگی۔ اور وہاں پر ایسی لذتیں ہوں گی جن سے عقل عاجز ہے۔ بلکہ ان کے تصور سے بھی عقل عاجز ہے۔

پس یہ دنیا جو رنج و غم ظلم و جور سے بھری ہے، تو پوری زندگی کے مقابلہ میں ایک مختصر سا مرحلہ ہے اور اس مختصر مدت کے زمانہ میں کئے ہوئے اعمال کا نتیجہ کچھ لوگوں کو رحمت الٰہی کی سعادت کی کی صورت میں ملے گا اور کچھ لوگوں کو عذاب ابدی یا ابلیس کا پڑوس ملے گا۔ پس کیا دونوں کا انجام ایک ہے؟ ایک کا انجام جہنم ہے اور یہ بہت برا انجام ہے۔ اور دوسرے کا انجام جنت ہے۔ اور یہ بہترین انجام ہے۔ اور لوگوں کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جس کو چاہیں اختیار کریں!

فطرت بھی بعث کو ضروری قرار دیتی ہے

علم اجتماع کے سیر تکامل کے لحاظ سے اگر ہم دنیا کی طرف دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ انسان ایک ایسے فکری مرحلے سے گزر چکا ہے جس میں حیات بعد الموت کے ایمان راسخ پر قائم رہا ہے اور یہ ایمانی مرحلہ العبا التاریخ تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ قبل از تاریخ والے مرحلہ میں بھی یہ عقیدہ پختہ طریقے پایا جاتا تھا۔

اور اس سلسلہ میں ماہرین آثار قدیمہ کے ذریعہ ظاہر ہونے والے آثار سے کافی مدد ملتی ہے۔ اور یہ آثار اس بات پر واضح طریقے سے دلالت کرتے ہیں کہ قدیم انسان ایک ایسی فکر سے سرشار تھا جو حیات بعد الموت پر مبنی تھی۔ چنانچہ اپنے مُردوں کے ساتھ جو آلات و وسائل یہ لوگ دفن کرتے تھے وہ خود اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ لوگ موت کے دروازے سے گزر جانے کے بعد نظریہ بعث کے قائل تھے۔ بس اتنا فرق ہے کہ ان کے تصورات پوری طرح سے صحیح نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد کی زندگی بھی بسر کرتا ہے۔ لہٰذا وہ

دوسری زندگی میں بھی ان اسباب و وسائل کا محتاج ہوگا، جن کا اس زندگی میں محتاج تھا اسی لئے مرنے والے کے ساتھ لوازمات زندگی کو بھی دفن کر دیا جاتا تھا۔

انسان نے چاہے جس دور میں زندگی بسر کی ہو اور چاہے جس زمین میں رہا ہو ہمیشہ اس کے ادراک کا حامل رہا ہے۔ اور وہ آج کے بعد کل والی زندگی کا منتظر رہا ہے۔ میرے نزدیک ان تمام تحلیلات ذہنی کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ جس کو بعض علمائے اجتماع نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو صرف اسی دنیا کی زندگی کے قائل ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ واقع سے بہت دور ہٹ گئے ہیں۔ اور موضوع کے سلسلہ میں صرف اجتماعی و اقتصادی اسباب سے بحث کرتے ہیں۔ اور ان خرافات و ترہات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جس کو بعض نام نہاد ادیان نے پیش کیا ہے۔ اور اس میدان میں اہم ترین چیز المعاد جاویہ کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔

حالانکہ اس قسم کے عمیق و بنیادی عقائد کا اثبات اس سادگی سے نہیں کیا جا سکتا جو محض تلقین یا عادت کا نتیجہ ہوں۔ کیونکہ تلقینات اور عادتیں استداد زمانہ کا ساتھ نہیں دے پاتیں۔ جو لوگ خیالات کے سمندر میں ڈوبے رہتے ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کی فطرت کی گہرائی سے جو اسطوری قسم کے بلکہ غیر مفہوم تصورات پیدا ہوں اس سے ان کو چھپا دیا جائے۔

رومی، مصری، بابلی، کلدانی، یونانی وغیرہ امتوں میں معاد کا عقیدہ موجود تھا اگر چہ بہت سے لوگوں کے یہاں یہ عقیدہ خرافات سے زیادہ مشابہ تھا اور منطق الٰہی توحیدی سے بہت دور تھا۔

مثلاً کانگو قبیلوں کے درمیان یہ رسم عام تھی کہ جب ان کا بادشاہ مر جاتا تھا تو اس کی قبر پر ۱۲ لڑکیاں نوجوان جمع ہو کر ایک دوسرے سے لڑتی تھیں اور جھگڑتی تھیں تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو بادشاہ سے مل جائیں۔ اور اس جھگڑے کا نتیجہ بسا اوقات بعض کے قتل کی طرف منتہی ہوتا تھا۔ جزیرہ فجی کے باشندے اس بات کے معتقد تھے کہ مردے بھی اسی طرح تمام امور میں مشغول ہوتے ہیں۔ جس طرح زندہ حضرات مثلاً شادی بیاہ، کھیتی باڑی، لڑائی جھگڑے وغیرہ۔

فرانسیسی فلکی عالم کامیل فلاماریون

کہتا ہے: جزیرہ فجی کے باشندوں کی عادت تھی کہ جب ان کے والدین چالیس سال کے ہو جاتے تھے تو ان

زندہ درگور کر دیتے تھے۔ چالیس سال کی عمر کو اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ تقریباً عمر کا وسطی حصہ یہی ہے اور زندگی کا کامل ترین مرحلہ یہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ مرنے والا یوم نشور اپنی اسی قوت وطاقت اور بدنی کمالات کے ساتھ اٹھے گا۔ مرتے وقت جو طاقت وقوت و کمال حاصل تھا۔

مشہور اجتماع کا عالم سیموئیل کنگ SAMUEL KING

کہتا ہے کہ: صرف آج ہی دین تمام اطراف عالم میں موجود نہیں ہے بلکہ گہرا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ بھی اس قسم کا دین رکھتے تھے جس طرح آج کے انسان کے اسلاف کے پاس — جس کو گذشتہ دور کا کہا جاتا ہے — بھی ایک قسم کا دین تھا۔ چنانچہ وہ لوگ اپنے مردوں کو مٹی میں مخصوص طریقے سے چھپا دیتے تھے۔ اور ان کے پہلو میں ان کے کاروبار کے اوزار رکھ دیا کرتے تھے۔ اور اس طریقے سے علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ لوگ عالم آخرت کا عقیدہ رکھتے تھے[1]

اسی طرح میکسیکو کے باشندے اپنے بادشاہوں کے ساتھ ان کے مسخروں کو بھی دفن کر دیتے تھے۔ تاکہ یہ مسخرے قبر میں اپنے لطیفوں اور لطیف حرکتوں اور مذاق و گفتگو سے ان کا دل بہلاتے رہیں اور ان کے دلوں سے رنج و غم کے آثار دور کرتے رہیں۔

تین ہزار سال قبل یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ انسان محض مرنے کی وجہ سے معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ مرنے کے بعد مخصوص زندگی حاصل کی جاتی ہے، جیسی زندگی اس دنیا میں تھی۔ اس زندگی کی ضرورتیں بھی ویسی ہوتی ہیں جو اس زندگی کی ہیں۔ اسی لیے وہ لوگ اپنے مردوں کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھ دیا کرتے تھے[2]

اگرچہ بعثت کا عقیدہ ان لوگوں کا خرافات یا حق و باطل سے مخلوط تھا لیکن امتدادِ زمانہ کے باوجود اس طرز فکری کا استمرار کم از کم اتنی بات تو ثابت ہی کرتا ہے کہ فطرت کی گہرائیوں میں اس کے بیج موجود ہیں۔ اور یہی بنیاد الہام و ادراک باطنی کے ذریعہ اس عقیدہ کو غذا دیتی رہتی ہے۔ اور انسان

---

[1] مشاہدات علمی صفحہ ۹۸ فارسی زبان

[2] جامعہ شناسی کینیئے صفحہ ۱۹۲ فارسی زبان

کی پیدائش کے وقت اس کی فطرت میں یہ بیج بویا ہوا ہوتا ہے[۳]

اور چونکہ تمام انسانی علوم اور بشری معارف بدیہیات اولیہ کے اساس پر قائم کیے گئے ہیں۔ اور یہ بات مسلم بھی ہے۔ اور اگر بدیہیات میں بھی شک و تردید کی گنجائش پیدا ہو جائے تو تمام علوم کی عمارتیں مسمار ہو جائیں گی۔ اس لئے اس قسم کے شکوک و شبہات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اور اسی لئے فطرت کی گواہی کو اتنا بڑا برہان مانا گیا ہے جس کے برابر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ کوئی منطق اس سے قریب ہے۔

بغیر کسی دلیل و برہان کے ہم اپنے دل کی گہرائیوں اور فطرت کے بھروسہ پر اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ وجود عدل و مسئولیت کی بنیاد پر قائم ہے۔ اور اس دنیاوی نظام میں خطا و صواب دونوں کا وجود ہے۔ اور ہمارے اخلاقِ ذات سے جو چیز بھی پھوٹتی ہے وہ ہمارے وجود کے ساتھ ساتھ وجود عام کے نظام کا بھی جزء ہے اور اس میں غلطی نہیں ہے۔ اور یہی انسانی فطرت انسان کے لئے وصول الی الحقیقت کا راستہ مہیا کرتی ہے۔

جب ہمارا ضمیر دل کی گہرائی سے وجود مسئولیت و حساب کی تائید کرتا ہے تو ہم عنقریب یقینی دلیل سے بڑی وضاحت کے ساتھ بعث کے حتمی ہونے کو محسوس کر لیں گے۔ کیونکہ اس بات کا حکم ہماری فطرت دیتی ہے۔ اور یہ تجرباتی یقین سے زیادہ قوی ہے۔

ہم بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات جانتے ہیں کہ عبث و لامسئولیت کا عالم واقعی کے اندر کوئی وجود نہیں ہے۔ اور محکم قوانین تمام موجودات میں جاری و ساری ہیں۔ کمزور ترین ذرہ سے عظیم اجرام سماوی تک یہ قانونِ محکم جاری ہے۔ نجوم و کواکب پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، سورج کا مادہ نوری طاقت کی طرف قانون کے تحت بدل جاتا ہے۔ ہر حرکت بلا معین ہی میں تمام کرتی ہے۔ بلکہ ذرہ میں چھپی ہوئی طاقت بھی بیکار نہیں جاتی۔ مختصر یہ کہ ہر موجود ایک آہنی نظام کے اندر ہے۔ اور سب ایک ایسے قانون کے تابع ہیں جو مضبوط و محکم ہے۔ اور استثناء بردار نہیں ہیں۔

---

[۳] ملل شرقی و یونان ص ۱۹۶ فارسی زبان

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمام موجودات کے اندر انسان کا سلوک سب سے الگ کیوں ہے۔ یہ عدل کی بنیاد پر کیوں قائم نہیں ہے؟ یہ انسان لوگوں میں ظلم و عدم انضباط ہرج و مرج کیوں پیدا کرتا ہے؟

اس کا جواب بھی آسان ہے کہ انسان اصل کا تمام موجودات سے الگ ہونا عقل و ارادہ کی نعمت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے ہے۔

ہمارے نقطۂ نظر کا میدان بہت ہی وسیع ہے۔ اگر خدا قوانین فطرت کی طرح ہمیں اطاعت پر مجبور خلق کرتا تو ہم اسی طرح ہوتے۔ لیکن اس کی حکمت بالغہ کا تقاضا تھا کہ وہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنائے اور اسے اختیار عطا کرے۔ اب اس کے باوجود اگر انسان ظلم و ستم کرتا ہے یا ہرج و مرج پیدا کرتا ہے تو اپنی حریت سے سوءِ استفادہ کرتا ہے یا پھر نفسانی خواہشات میں مبتلا ہے۔

چونکہ یہ دنیا بعد میں پیش آنے والے مراحل کے لئے امتحان گاہ ہے۔ اس لئے یہ زندگی بھی ظلم اور غصب حقوق سے مملو ہے اور یہ مکمل زندگی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت ایک بہت ہی طویل قصہ کے لئے جو غیر متناہی ہے یہ ایک مختصر سا فاصلہ ہے۔

اسی لئے ہمارا فطری احساس کہتا ہے کہ اگر کسی مخصوص اسباب کی وجہ سے ظالم زمینی عدالت کے ہاتھ نہیں آتا یا لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والا قانون کے شکنجے میں نہیں پھنستا یا کسی مجرم سے حق وصول نہیں کیا جا سکا تو یہ سب آخرت میں قانون و ضوابط کے مطابق دقیق حساب سے کسی بھی طرح نہیں بچ سکتا۔

لہٰذا وجود میں نظام عدل کا حتمی ہونا اور ضروری ہونا انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کہیں نہ کہیں تو اس سے باقاعدہ حساب کتاب ہوگا۔

اور اگر عدالت واقعی ایک وہمی و فرضی چیز ہوتی اور ہم جسے اپنے دلوں میں محسوس کرتے ہیں وہ حقیقت سے خالی ہوتا تو فطری طور پر ہم اپنے لئے اور دوسروں کے لئے عدالت کا مطالبہ کیوں کرتے؟ اور حقوق کے برباد ہونے پر ہمارے دل میں شعلے کیوں بھڑک

اٹھتے ؟ اور حقیقی عدالت کے لئے ہم اپنی جان کی بازی کیوں لگا دیتے ؟ اور عدالت کی محبت ہمارے دل کی گہرائیوں میں کیوں ہوتی ؟ کیا ہم کسی ایسی چیز کا اشتیاق رکھتے ہیں جس کا مطلقاً کوئی وجود ہی نہ ہو۔؟ کیا یہ اندرونی طلبِ عدالت اسی طرح وجودِ عدالت پر دلیل نہیں ہے، جس طرح پیاس وجودِ آب کی دلیل ہے۔

حیاتِ ابدی کی امید ایک بنیادی شئے ہے۔ جس کی کاشت انسانی فطرت میں ہے اور ابدی بقاء کوئی عارضی رغبت نہیں ہے۔ اور نہ ہی امر اکتسابی ہے اور ابدی بقاء کی خواہش بھی لوگوں کے کسی مخصوص فرقہ سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک فطری خواہش ہے جو ہر جا پہنچے کسی مناسب موقع پر پوری ہو جاتی ہے۔ مگر ابدی زندگی کی خواہش اس دنیا میں تو ممکن نہیں ہے لہٰذا اس کی تکمیل کے لئے ایک دوسری دنیا ماننی پڑے گی۔

پس اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ اعماقِ انسان میں کاشت شدہ خواہش لغو اور بےکار نہیں ہوتی۔ ہم یہ نتیجہ نکالتے میں حق بجانب ہیں کہ جو انسان بھی موت کی طرف بڑھتا ہے، اور اس دنیا کے فانی کو وداع کرتا ہے، اس کی حقیقتِ وجود باقی رہتی ہے اور صرف دوسری دنیا میں اپنی فطری خواہش۔ ۔ ۔ ۔ یعنی حیاتِ ابدی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی تکمیل کر پاتا ہے، اور یہ خود انسان کی حیاتِ ابدی کی دلیل ہے۔

NORMAN VINCEN یورپی محقق ڈاکٹر نارمن ونسن

حیاتِ ابدی میں کہتا ہے: جو بھی شک و تردید متزلزل نہ ہو، یقینی ہے اور ہمارا ایمان ہے اور عقیدہ ہے کہ حیاتِ ابدی رد کے قابل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فی نفسہ حیاتِ ابدی کا فطری شعور خود ایک دلیل ہے، جو ہمیں اس حقیقت کی رہبری کرتی ہے۔ اگر خدا انسان کے لئے کسی چیز کی کامیابی کا ارادہ کرتا ہے تو ابتداء ہی سے اس کے بیج کو اس کے اعماقِ ضمیر میں کاشت کر دیتا ہے اور یہ واضح ہے کہ انسان کی عشقِ بقاء اور امیدِ خلود تمام کائنات سے ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ ہم یہ کہہ دیں کہ یہ امید کبھی بھی پوری نہیں ہوگی!

ماورائے طبیعت کے حقائق پر عقل انسانی دلیل و برہان سے مطمئن نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک باطنی الہام ہے جو عقل کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے۔ حقائق عالیہ کے سلسلے میں الہام کا ایک اہم کردار ہے۔ ؎

حیات ابدی کا عقیدہ ادیان کبیرہ کی ایک اصل مانا جاتا ہے۔ اور ادیان الٰہیہ کا جزو لاینجزیٰ ہے انبیائے کرام کی رسالت میں اس عقیدہ کا کافی اہتمام کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس نے اپنے ماننے والوں کو ایک ایسے مستقبل کی خبر نہ دی ہو کہ جس میں ثواب یا عقاب ملے گا۔ اور اس مستقبل میں لوگ اپنے اعمال کے لحاظ سے یا کمال حاصل کریں گے یا انحطاط کے درجہ میں پہنچ جائیں گے۔

پروردگار عالم مبدع ہے اور منظم کائنات ہے۔ اور وہ اپنے بندوں کی طرف لطف و کرم کی بے پایاں نظر رکھتا ہے۔ اسی لئے اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ اس نے اپنے بندوں کے اعماق میں ایک فطری اور واضح دلیل پیدا کر دی ہے اپنی رحمت کی تکمیل کے لئے انبیائے کرام کو کتاب دے کر بھیجا تاکہ یہ حضرات لوگوں کو ان کے واجبات بتائیں اور حقیقت بعث کی تاکید کریں۔ کتاب دینیہ کے ساتھ بھیجنے کی وجہ یہ ہے، کہ نفس کی خواہشات، عادتیں، مادی رغبت فطرت کی بہت سی شعاؤں کو بجھا دیتی ہیں اس وقت افق انسانی تک انسان کی ترقی اور قید و بند سے آزادی کے لئے صرف باطنی دلالت کافی نہیں ہوتی بلکہ خارجی دلیلوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

؎ دانستیہای جہان علم ص ۲۰۳، ۲۰۵، فارسی زبان

فہم معاد کے لئے

علوم جدید نے نئے آفاق کھول دیئے

سالہا سال کی پے در پے انتھک کوششوں کے درمیان انسان نے تجرباتی علوم کے اندر جو پیشرفت کی ہے اس کا ایک سب سے قیمتی پھل یہ ہے کہ علمی طریقوں سے حیاتِ انسان کی تجدید کا امکان مان لیا گیا ہے۔ اور اس میدان میں بشر کے علمی انقلاب نے تحقیقاتِ علمیہ کے لئے بہترین میدان مہیا کر دیا ہے۔ چنانچہ اب علماء معاد سے متعلق مسائل کو بالکل ہی نئے ڈھنگ سے سوچنے لگے ہیں۔ اور پہلی مرتبہ بڑی گہرائی اور اہتمام سے اس کے بارے میں بحث کرنے لگے ہیں۔ اور ان تمام باتوں نے موضوع کو سمجھنے میں بہت ہی بہتر طریقہ سے مدد دی ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو باتیں اب تک ظاہر ہوئی ہیں وہ اس بات کی خوشخبری دے رہی ہیں کہ علمی تحقیقات تکامل وابداع کی طرف مائل بہ ترقی ہیں۔ اس لئے اب اطمینان سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علم کا سایہ جتنا بڑھے گا اور علم کی زندگی جتنی طویل ہوگی وہ عقیدۂ معاد کے غموض وابہام کو بہت بڑی حد تک دور کر دے گی۔

پہلے کے مادی علماء جب بھی معاد کے موضوع پر بحث کرتے تھے وہ پہلے سے یہ فرض کر لیتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ نئی زندگی ناممکن ہے۔ اسی لیے وہ لوگ معاد کے مسئلہ کو علمی مسئلہ نہ بنا سکے۔ اور نہ ہی اس کے ساتھ علمی اسلوب برت سکے

اس سلسلہ میں علمی دراسات کا جو پہلا نتیجہ ظاہر ہوا ہے وہ مشہور فرانسیسی عالم

لاؤزیہ جو علم کیمیا کے

موسس بھی ہیں ——— کی وہ گفتگو ہے جس نے اس علم کے قدیم نظریات کی ایک حد

معین کر کے ان کی قدر و قیمت گرا دی۔ کیونکہ اس شخص نے اپنی پوری عمر ایسے وسیع تجربوں میں صرف کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات کے اندر جسم و مادہ کی مقدار کا مجموعہ ثابت ہے۔ نہ اس میں کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی . . . . اور یہ قانون اگرچہ بعض انکشافات کی وجہ سے ٹھیس کھا گیا کیونکہ اشعاعاتِ ذریّہ کے انکشافات نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ طاقت کی صورت میں بدل سکتا ہے مگر پھر بھی یہ قانون "اصل بقاء المادۃ والقانون" کے عنوان سے اب تک مقبول ہے۔

اس بناء پر اس کائنات کے اندر جب مادہ میں بھی کیمیائی فعل و انفعال ہوگا وہ فعل و انفعال اس مادہ کی شکل بدل دیں گے لیکن اس درمیان میں اس مادہ کے عناصرِ وجود میں سے کوئی بھی عنصر معدوم نہیں ہوگا۔ ہم جن چیزوں کو بھی دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں وہ مختلف ذات کا ایک مجموعۂ مرکب ہے اور اس کے متغیر کر دینے والے خواص ہیں۔ بہرحال اب یہ نظریہ . . . . . کہ وجود کبھی معدوم نہیں ہوتا . . . . سابق نظریہ کی جگہ پر آگیا ہے اور اسی نظریہ کی بناء پر تمام تغیرات و تبدلات ممکن ہیں۔

پانی کا جو قطرہ زمین پر گر کر ختم ہو جاتا ہے، سگریٹ کا دھواں جو فضا میں جا کر ضائع ہو جاتا ہے، وہ مواد جو بڑی بڑی فیکٹریوں میں تباہ ہو جاتے ہیں، لکڑیوں اور شمعوں سے نکلنے والی شعاع جس کے ذرّے فضا میں ناپید ہو جاتے ہیں یہ ساری کی ساری چیزیں معدوم نہیں ہوتیں اور اگر ہمارے پاس ایسے آلات ہوں جن سے ہم اُن کے اجزاء کو جمع کر سکیں تو پھر اس کے مواد اولیہ بلا کم و کاست اپنی اصلی صورت پر پلٹ آئیں گے لہٰذا سطحی نظر رکھنے والے اور محدود و ناقص فکر رکھنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب معدوم ہو گئے۔

دنیا جانتی ہے انسانی جسم مٹی سے بنا ہے اور تحول و تغیر کی ایک مدت گزر جانے کے بعد وہ پھر مٹی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے باطن میں مختلف تغیر کی استعداد رکھتا ہے مگر ان تغیرات و تحولات کے درمیان نہ تو اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے اور نہ ہی معدوم ہو جاتا ہے بلکہ تمام اجسام کی طرح صرف اس کی کیفیتِ ترکیب مفقود ہو جاتی ہے، اس کی ذات میں سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس بناء پر جب انسان مردہ جسم خارجی و داخلی عوامل کی تاثیر کی بناء پر

مٹی بن جاتا ہے اور پھر سے اس کی ایک نئی شکل ہوتی ہے کہ کسی دن وہ نبات بن کر ابھرتا ہے۔ اور حیوان کی غذا ہو کر حیوان کے جسم کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ لیکن اس کا جوہر بہر حال ثابت رہتا ہے۔ اور ان تمام تحولات کے درمیان وہ معدوم نہیں ہوتا۔

یہاں تک کہ ہمارے نیک اعمال بھی منتشر ہونے والی طاقت کی مختلف شکلیں مادیت کا رنگ اختیار کر کے تحزنیہ کا ئنات میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اور سعادت و خیر کی حیثیت سے یا شقاوت و عذاب و ماتم کی حیثیت سے ہمارے انجام کی یقینی شکل و صورت اختیار کر لینے کی عامل موثر بھی طاقت ہے۔

ہمارے زمانے میں فنون ٹیکنالوجی کے محققین اور علماء کی کوششیں اس حد تک ترقی کر گئی ہیں کہ وہ سابق بنی انسان کی آواز کی موجوں کو واپس لا سکتی ہیں اور وہ ایک مخصوص حد تک پیچیدہ آلات کے ذریعہ بعض صنعت کاروں کی ان آوازوں کو جو باقی ہوئی چیز پر ارتعاش کی صورت میں تھیں اکر بھی واپس لا سکتی ہیں۔

بذات خود یہ علمی کامیابیاں بعث کے حق ہونے پر دلیل ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ جس سے معاد کے بارے میں غور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا نظریہ ہے جو غور و فکر سے مقرون ہے اور علمی طریقے سے اس کا اثبات کیا جا سکتا ہے۔ اور جب ایسا ہے تو پھر خدا انسانی جسم کے ذرات جو منتشر ہو چکے ہیں انہیں واپس لا کر دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے؟

قرآن اس حقیقت کی طرف متعدد بار اشارہ کرتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَٰكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (سورہ طٰہٰ آیۃ ۵۵) یعنی ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا اور مرنے کے بعد اسی زمین میں لوٹا کر لائیں گے اور اس سے دوسری بار (قیامت کے دن) تمہیں نکال کھڑا کریں گے۔ یہ آیۂ کریمہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ہم خداوند عالم کی قوت خلاقہ میں غور و فکر کریں۔ اور یہ آیۂ دنیا و آخرت میں انسان کے ماضی و مستقبل کو کچھ ایسے انداز سے پیش کر رہی ہے

جو انسان کے مضطرب دل کو سکون عطا کرتا ہے۔ کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا کیونکہ ایسا ہونے پر خلقت میں ہونے والے تغیرات بے مقصد و عبث ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ زندگانی دنیا میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خلقت کی بنیاد بن سکے اور اگر ہم پورے انظام (وجود) کو بنظر غائر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نتیجہ بہت ہی کمزور ہے یا اس مقدمۂ رفیعہ و عظیمہ کی قیمت نہیں قرار پا سکتی۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ زمین کے کیمیاوی اثرات کی وجہ سے انسان کا جسم منتشر و ناپید ہو کر ضائع و ختم ہو جاتا ہے اور دوبارہ اسے زندہ نہیں کیا جا سکتا، قرآن انہیں متوجہ کر کے کہتا ہے: فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِیْدٌ ۔ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِیْظٌ ۔ (س ق، آیہ ۲، ۳، ۴)

پس کفار کہنے لگے یہ تو ایک عجیب چیز ہے۔ بھلا جب ہم مر جائیں گے اور (سڑ گل کر) مٹی ہو جائیں گے تو پھر یہ دوبارہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید (بات) ہے۔ ان کے اجسام سے زمین جس چیز کو (کھا کھا کر) کم کرتی ہے وہ ہمیں معلوم ہے۔ اور ہمارے پاس تو تحریری یادداشت کتاب (لوح) محفوظ (موجود) ہے۔

جو لوگ مُردوں کے زندہ ہونے کی تصدیق نہیں کرتے یہ آیہ ان لوگوں کے لئے بیان ہے اور یہ آیت اس بات کی تصریح کر رہی ہے کہ بدن کے تکوین میں استعمال شدہ عناصر جو تھوڑا تھوڑا کر کے سڑ گل جاتے ہیں اور خزانۂ فطرت میں پلٹ جاتے ہیں ہم ان کی جگہ کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ قیامت کے دن ان کے متفرق اجزاء کو ہم جمع کریں گے اور بدن کو از سر نو زندہ کریں گے، جسے تم امر محال خیال کرتے ہو۔ یہ اگرچہ ایک جدید قالب میں ہے۔ لیکن پھر بھی پہلے کے مثل ہے۔

صدر اسلام میں ایک مرتبہ رسول خدا (ص) معاد کے بارے میں تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں

(ابی بن خلف نامی ایک شخص صحرا کی طرف سے آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک کھائی ہوئی ہڈی کا ٹکڑا تھا۔ رسولِ خداؐ اور قرآن کے سامنے کہیں مغلوب نہ ہو جائے اس ڈر سے اس نے اسے ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اور یہ طے کر لیا کہ نفیِ معاد کی یہ زندہ دلیل ہے چنانچہ جب وہ رسولِ خداؐ کے پاس پہنچا تو اس پسی ہوئی ہڈی کو فضا میں منتشر کر دیا اور بہت ہی درشت لہجہ میں کہنے لگا "مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ" ؟ ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون دوبارہ زندہ کر سکتا ہے ؟

اس کا خیال تھا کہ اس دلیل سے وہ رسولِ خدا کو شکست دے کر دوسروں کو بھی نفیِ معاد پر آمادہ کرے گا۔ اور احیائے موتیٰ کا نظریہ ہی باطل ہو جائے گا . . . .

اس کے جاہلی افکار اس حد تک ناقص تھے کہ وہ خلقتِ موجودات کے بارے میں واضح نظریہ نہیں رکھتا تھا اور نہ اس مشکل کا اس کے پاس کوئی جواب تھا جو ابھی تک درپیش ہونے والی تھی۔ اس کا خیال تو یہی تھا کہ وہ بوسیدہ ہڈیاں جو مٹی بن چکی ہیں، اور آفاقِ متباعدہ میں اس کے ذرات منتشر ہو چکے ہیں ایسے معدوم کے اعادہ کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اور وہ اس بات پر مصر تھا کہ تدریجی طور پر بدن کا منتشر ذروں میں بدل جانا ایسی بات ہے کہ عقل اس کے اعادہ کو قبول ہی نہیں کرتی۔ اور یہ منتشر ذرے دوبارہ زندگی پالیں، یہ ناممکن ہے۔

لیکن قرآن نے بہترین اسلوب اور قوی استدلال کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنْتُمْ مِنْهُ تُوقِدُونَ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ۔ (س یٰسین آیۃ ۷۹ تا ۸۱)

(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اس کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو (جب یہ کچھ نہ تھے) پہلی مرتبہ زندہ کر دکھایا۔ وہ ہر طرح کی پیدائش سے واقف ہے۔ جس نے تمہارے واسطے

(مرخ وعفار کے) ہرے درخت سے آگ پیدا کر دی۔ پھر تم اس سے (اور) آگ سلگا لیتے ہو (بھلا) جس (خدا) نے سارے آسمان اور زمین پیدا کئے کیا وہ اس بات پر قابو نہیں رکھتا کہ ان کے مثل (دوبارہ) پیدا کر دے، ہاں (ضرور قابو رکھتا ہے) اور وہ تو پیدا کرنے والا واقف کار ہے۔

قرآن مجید اس عقل انسانی کو "جو معرفت و ادراک سے آراستہ ہو" دعوت دیتا ہے کہ خدا اس بنائے وجود میں جو عظیم ہے اور اس کے اندر جو ظاہر و دقیق جزئیات ہیں، اور ان میں جن محکم و مضبوط قوانین کو صرف کیا گیا ہے، غور کرے تو خود وہ اس نتیجہ پر پہنچ جائے گی کہ قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا صحیح غور و فکر افکار بسلیم تک منتج ہوگی ——— اس لئے انسان کو چاہئے کہ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے اس سے واضح طور پر اس قدر استفادہ کرے کہ جو اسے گہرے مسائل تک پہنچنے میں مددگار ہو ———

اعادہ ترکیب کے موضوع پر قرآن مجید اعلان کرتا ہے: اَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ۔ (س ق آیہ ۱۵)

تو کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں؟ (ہرگز نہیں) مگر یہ لوگ از سر نو (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت شک میں (پڑے) ہیں ——— قرآن انسان کو اس بات کی طرف متنبہ کرنا چاہتا ہے کہ اعادۂ حیات جو بشر کی قدرت کے لحاظ سے ناممکن نظر آتی ہے۔ نہ کوئی پیچیدہ بات اور نہ قدرت خدا کو دیکھتے ہوئے کوئی محال بات ہے۔

یہ لوگ سوال کر سکتے ہیں کہ ہمارے اجزائے بدن جو فضا اطراف زمین میں منتشر ہیں ان پر نسیم حیات کیسے چل کر غیر زندہ مادہ سے زندہ موجود پیدا ہو گیا۔ قرآن سے کہا جا سکتا ہے کہ ابھی تو یہ اجزا زیادہ سے زیادہ ادھر ادھر منتشر تھے لیکن جب یہ کچھ نہ تھا تو خدا نے کس طرح پیدا کر دیا تھا؟ پس جس طرح عناصر بدن کی ایک دوسرے سے فوری اس کے علیحدہ علیحدہ کر دینے میں کوئی دشواری پیدا نہیں کرتی اسی طرح خدا کی لا محدود خلاقیت کو دیکھتے ہو

یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ ان ذرات متباعدہ کو اکٹھا کر کے دوبارہ زندگی عطا کر دے۔

خود قرآن خدا کی لامحدود قدرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یاد دلاتا ہے کہ وہ جسم انسانی کو اس کی خصوصیات و ممیزات دقیقہ کے ساتھ دوبارہ خلق کرنے پر قادر ہے ارشاد ہے:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ

(سورہ قیامت آیہ ۳،۴) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو (بوسیدہ ہونے کے بعد) جمع نہ کریں گے (ہاں ضرور کریں گے) ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کریں ـــــــ

اس آیت میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ خدا صرف مردوں کی بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کر کے نئے سرے سے پیدا کرنے پر ہی قادر نہیں ہے بلکہ آفاق میں پھیلے ہوئے ذرات کو بھی اکٹھا کر کے ایک دوسرے سے مرتبط کر کے دوبارہ زندگی بخش سکتا ہے۔

جب قوت الٰہی خلق کائنات کے حرف آخر کی تکمیل کے لئے انسان کو دوبارہ پیدا کر سکتی ہے تو جس طرح اس نے ایک ایسے مردہ کرہ پر جس میں کوئی حرکت بھی نہ تھی، زندگی عطا کر دی اسی طرح وہ قیامت کے دن انسان کو دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔ اور کوئی بھی عاقل خدا کی لامحدود قدرت کو چیلنج نہیں کر سکتا کہ وہ انسان کو اس کی تمام جسمانی خصوصیات کے ساتھ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا۔

اس آیت کے اندر ایک عجیب و غریب بات بیان کی گئی ہے کہ خدا نے جسم انسانی کے تمام عجائبات میں صرف انگلیوں کی لکیروں کا تذکرہ کیا ہے اور اس عنوان سے کہ یہ لکیریں اس کی قدرت کی دلیل ہیں کیونکہ دیگر اعضاء میں یہ احتمال ہے کہ دیگر افراد بعض اعضاء میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔ لیکن پوری کائنات میں دو شخص بھی ایسے نہیں ملیں گے جن کی انگلیوں کی تمام لکیریں بالکل ایک دوسرے کے مشابہ ہوں۔

تجرباتی علوم نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ عمر کے تمام مراحل میں اور ترکیب جسم پر

طاری ہونے والے تمام تغیرات کے باوجود پوروں کی لکیریں ایک ہی حالت میں ثابت
موجود رہتی ہیں۔ اور یہ بات جسم انسانی پر یکے بعد دیگرے تغیرات ہونے کے ساتھ بالکل
الگ ہے۔ اور اگر پوروں کی کھال کسی وجہ سے کبھی الگ ہو جائے تو اس کی جگہ نئی پیدا ہونے والی
کھال بعینہ پہلی والی کھال کی تمام خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پوروں کے
نشانات کے ماہرین اچھی طرح جانتے ہیں کہ افراد کی شناخت کے لئے بہترین وسیلہ یہی
نشاناتِ انگشت ہیں۔

اور آج کے زمانہ میں تو انگلیوں کے نشانات ایک وثیقہ معتبر ہیں۔ مجرمین کی شناخت
کے لئے پولیس انہی نشانات سے مدد لیتی ہے۔ ۱۴ قرن پہلے تک یہ خصوصیت
لوگوں کے علم میں نہیں تھی۔ یعنی نزولِ قرآن سے پہلے کوئی اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا۔ خود
انگریز اس بات کی طرف سنہ ۱۸۸۴ء میں متوجہ ہوئے ہیں۔ اور یہیں سے عقل انسانی بغیر کسی
شک و تردید کے سمجھ لیتی ہے کہ تمام عجائب کے ظہور میں براہِ راست خدا کی قدرت کو
دخل ہے۔ ورنہ بھلا کوئی صاحبِ عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اندھی میکانیکی حرکت
نے اس قسم کے عجائب کی تخلیق کی ہے۔

دنیا میں تجسم بعث

اس کائنات میں ہم ایسی حرکت دیکھتے ہیں جس کے لئے توقف نہیں ہے اور مردہ چیزوں کی
دوبارہ زندگی کے بہترین مناظر ملاحظہ کرتے ہیں۔ اگر آپ سردیوں کے زمانہ میں کھیتوں اور
باغات کی طرف گردش کریں تو وہاں ایک سکوت و جمود پائیں گے، جس کی تشبیہ ایک
ایسے انسانی مقبرہ سے دی جا سکتی ہے جہاں سناٹا ہی سناٹا ہے کوئی حرکت نہیں ہے۔
یہ ساکن فضا وجود دلوں میں انقباض پیدا کر دیتی ہے، اس میں نہ تو درختوں میں پتے
ہیں نہ پھول نہ طراوت اور یہ سلسلہ اسی طرح اوائل ربیع تک باقی رہتا ہے اور ربیع کے

آتے ہی نباتات میں نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ زمین کی قوتِ نشوونما بیدار ہو جاتی ہے نباتات اپنے نقطۂ زندگی کی طرف پلٹ آتے ہیں اور اسی زمانہ میں کل کے مُردوں پر جب نسیمِ حیات چلتی ہے تو دفعتاً ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ خاموش درختوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں جدید روح حلول کر جاتی ہے۔ کل تک جن درختوں میں خشکی اور عریانیت تھی آج وہ ہرے بھرے پتوں سے لدے ہیں، کلیاں چٹک گئی ہیں وہ زمین جو کچھ مدت سے مردہ تھی ربیع کے آتے ہی اس میں نئی زندگی آ جاتی ہے۔ ہرے بھرے باغات رنگ برنگے پھولوں سے، سبزوں سے اور زمین سبزہ زاروں سے بھر جاتی ہے اور اس طرح وہ قطعۂ زمین جو انقباض پیدا کرتا تھا اب دل کو سرور بخشنے لگتا ہے۔

یہ مناظر جن میں موت کے بعد دوبارہ زندگی پلٹ آتی ہے ہماری نظروں کے سامنے ہر سال آتے ہیں لیکن بہت سے لوگ ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ اور بجائے اس کے کہ ان مناظر کو دیکھ کر رگِ تجسس کا خون جوش مارنے لگے اور اس سے نئے نئے طریقۂ استدلال و قیمتی دروس حاصل کئے جاتے اور صحیح استنباط کیا جاتا، لوگ بے پرواہ ہو کر اور ہنستے کھیلتے گزر جاتے ہیں۔

انسان کی غور و فکر بھی سعی و پختہ کاری کی محتاج ہے۔ اور پیچیدہ مسائل کے سمجھنے کے لئے دقتِ نظر اساس و بنیاد ہے۔ لیکن روزمرہ کی زندگی میں خارجی واقعات کی طرف اہتمام نہ کرنا انسان کو آس پاس بکھرے ہوئے حقائق سے اس قدر اجنبی بنا دیتا ہے کہ وہ رنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ فکری بانجھپن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف مختلف چیزوں کے بارے میں تأمل کرنا اور اس نظام میں موجود ظواہر کے تغیر میں غور کرنا ہر پیچیدہ یا بسیط تحول کے بارے میں تحلیل سلیم انسان کو دنیا و ما فیہا کے بارے میں ایک عمیق ادراک عطا کرتا ہے۔ اور اپنے مکتسبات کی صحیح قدر و قیمت لگانے اور ممکن حد تک اس سے استفادہ کرنے کی قدرت بخشتا ہے

چنانچہ بہت سے علماء ایسے ہیں کہ جنہوں نے ان مناظر کو دیکھ کر اور لوگوں کی حیات و ممات

کا مشاہدہ کر کے اپنی عقلوں کے سہارے مفہوم بعث و نشور کو مجسم کر کے دیکھ لیا ہے۔
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غور و فکر کی قدرت، مشاہدات عینیہ کی ترتیب و تنظیم اور اخذ نتیجہ کے لئے ان میں ربط، یہ چیزیں صرف علماء اور متخصصین ہی سے مخصوص ہیں، جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور نہ اس پر کوئی دلیل قائم ہے۔ بلکہ مسائل کے اندر غور و فکر اور ان کی معرفت کا دروازہ اپنے اپنے علم و ادراک کے لحاظ سے سب پر کھلا ہے اور ہر شخص اپنے آس پاس بکھرے ہوئے حوادث و ظواہر سے بقدر استطاعت استفادہ کر سکتا ہے۔

پس اگر یہ زمین کل تک خشک تھی اور درخت پتوں سے عریاں تھے کیونکہ ایسے اسباب و ظروف موجود تھے جو زندگی کے مساعد تھے اور وقتی طور سے انہیں نشو و نما و حرکت سے روک دیا تھا اور ہم اس میں آثار حیات نہیں پا رہے تھے تو آج فطری عوامل اور فیضان ابر کرم کی بدولت یہ چیزیں زندگی میں ڈوبی ہیں طراوت و حرکت سے بھرپور ہیں ــــ پھر آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ہم اس فطری قانون کو صرف نباتات کی موت و حیات ہی تک محدود کر دیں۔؟

کیا انسان کے لئے اسی قسم کے بعث کی نفی پر کوئی دلیل ہے؟ اور کیا یہ بات انسان کے لئے ناممکن ہے؟ موت و حیات کے لئے یہ نباتات بہترین نمونہ ہیں۔ ان مردہ نباتات میں جن کے اندر حرکت نہیں ہوتی ایک ایسا زندہ خلیہ جو پرسکون و مستقر ہوتا ہے موجود رہتا ہے۔ اور وہ اپنی اسی شکل میں صحیح و سالم رہتا ہے اور ہزاروں سال تک قابل زراعت رہتا ہے چنانچہ جب بھی ان بذور کی کاشت کی جائے، رطوبت و طراوت کی وجہ سے یہ خلایا (خلیہ کی جمع ہے) دوبارہ بیدار ہو جاتے ہیں اور زمین کا سینہ چاک کر کے کلیوں، پھولوں اور چھوٹے چھوٹے درختوں کی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد مٹی ہو جاتا ہے، لیکن جب قیامت آئے گی اور زندگی کے دوبارہ پلٹنے کے لئے ظروف مساعد ہو جائیں گے تو جسم کے ذرے متحرک ہو جائیں گے اور جس طرح ان بذور سے نباتات پیدا ہو جاتے تھے ان سے جسم پیدا ہو جائیں گے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نشاۃ ارض سردیوں کے زمانہ میں فطری عوامل میں فشار کی وجہ سے معطل ہو جاتا ہے اور اسے وقتی توقف کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقی موت نہیں ہے اور نسیان زندگی کو بالکل قطع ہو جانا ہرگز نہیں ہے بلکہ صرف وقتی توقف ہے البتہ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ابتدائے خلقت میں زمین کسی بھی جاندار موجود کے وجود سے خالی تھی اور جب زندگی کے مناسب ظروف واسباب بکثرت ہوگئے تو اس مردہ زمین سے زندگی کا پہلا خزانہ اٹھا

یقیناً زندگی ایک بہت گہری حقیقت ہے اور یہ مجہول عنصر حیات ذرات کے سینے میں ہزاروں سال مخفی طریقہ سے محفوظ رہتا ہے اس میں کسی قسم کی حرکت نہیں ہوتی لیکن جیسے ہی ظروف مساعد ہوتے ہیں اور شروط مہیا ہو جاتے ہیں تو انہیں ذرات و جسلایا کے سینوں سے جو مٹی میں دفن ہیں زندگی پھوٹ پڑتی ہے۔ اور یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کی تردید پر ابھی تک کوئی علمی دلیل قائم نہیں کی جا سکی اور اس کی ——— یعنی عنصر حیات ہزاروں سال زندہ رہتا ہے........ دلیل یہ ہے کہ محققین علماء نے کچھ ایسے فرومات ——— جراثیم ——— کا انکشاف کیا ہے جنہیں الیکٹرانک بڑی دوربینوں سے بھی نہیں دیکھا جا سکتا ——— حالانکہ الیکٹرانک دوربین چیزوں کو ان کے حجم سے کروڑوں درجہ بڑا کرکے دکھاتا ہے ——— پس یہ فرومات جو بہت ہی چھوٹے حجم کے ہیں اور انہیں دیکھنا ناممکن ہے چاہے ہم انہیں کروڑوں درجہ بڑا کرکے دیکھیں پھر بھی ان کا دیکھنا ممکن نہیں ہے اور اتنے چھوٹے ہونے کے باوجود ان میں زندگی و حرکت پائی جاتی ہے اور اتناج نسل کی صلاحیت بھی باقی رہتی ہے۔

پس انسان ان چھوٹے جراثیم کی زندگی کے بارے میں جا ہے جتنی تلاش کرلے وہاں کی انتہا کو نہیں جان سکتا۔ اور ابھی تک تو انسان ان جراثیم کی تعیین نہیں کر سکا ہے جو موروثی صفات اور والدین و اجداد کی خصوصیات نقل کرتے ہیں۔

پھر جب زندگی ان غیر مرئی اجزاء کے اعماق میں چھپی ہے اور انسان کی رسائی
وہاں تک نہیں ہے اور نہ ہی تغیر و تبدل کا کوئی عامل انہیں ان کی پوشیدہ جگہ سے نکال سکتا ہے
اور نہ ہی ان پر کچھ اثر انداز ہو سکتا ہے تو پھر ہمارے پاس وہ کون سی دلیل ہے جس کے ذریعے
ہم یہ ثابت کر سکیں کہ زمین کے اندر انسانی بدن کے جو خلیے منتقل ہو جاتے ہیں چاہے وہ ایک
طویل مدت تک مستقر رہیں ان کے اعماق میں مخفی طور سے زندگی کا محفوظ ہونا غیر ممکن ہے؟
یا یہ کیوں ممکن نہیں ہے کہ جس طرح موسم سرما میں حشرات اپنی نیند میں ڈوبے ہوتے ہیں
لیکن اس موسم کے ختم ہوتے ہی ان میں حرکت و نشاط پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح
انسان کے لیے ہو؟ اور آخر وہ کون سا معذور ہے جس کی بنا پر آپ موت کے بعد
دوسری زندگی کو محال سمجھتے ہیں؟

قرآن مجید جس کی نظر وسیع وجود کے تمام اطراف پر چھائی ہوئی ہے وہ بنی انسان
کی دوسری زندگی اور نباتات کی دوسری زندگی کے درمیان مقارنت ثابت کرتا ہے تاکہ مسئلہ کی
وضاحت کرے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا
فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَنَّاتٍ وَحَبَّ الْحَصِيدِ وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَهَا
طَلْعٌ نَضِيدٌ رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا كَذَٰلِكَ
الْخُرُوجُ (س۔ق آیت ۹ تا ۱۱) اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا
تو اس سے باغ (کے درخت) اگائے اور کھیتی کا اناج اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا بور
باہم گتھا ہوتا ہے (یہ سب کچھ) بندوں کو روزی دینے کے لئے (پیدا کئے) اور پانی
ہی سے ہم نے مردہ شہر (افتادہ زمین) کو زندہ کیا۔ اسی طرح (قیامت میں مردوں
کو) نکلنا ہوگا ——— دوسری جگہ ارشاد ہے وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ثُمَّ
يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا (س۔ نوح، آیت ۱۷ تا ۱۸)

اور خدا ہی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا پھر تمہیں اسی میں دوبارہ لے جائے گا
اور قیامت میں) اسی سے نکال کھڑا کرے گا ــــــــ

یہ آیات منکرین حیات بعدالموت کو دلیل پیش کر رہی ہیں۔ اور یہ دلیلیں اسی دنیا وی زندگی سے ماخوذ ہیں جس کو یہ لوگ محسوس بھی کرتے ہیں اور ان پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ قرآن کا مقصد ان لوگوں کو اس خطرناک مستقبل کی طرف ہدایت کرنا ہے۔ اور یہ آیتیں منکرین کو بزبان قاطع اور کتاب فطرت کی عجیب و غریب علامتوں سے جواب دے رہی ہیں ــــــــ لیکن اس کے باوجود کچھ ایسے معاند و کج قسم کے لوگ ہیں جو اپنی عقل استعمال ہی نہیں کرتے اور ان زندہ دلیلوں کے سامنے آنکھ بند کرکے گزر جاتے ہیں۔ اور ان چیخنے والے حقائق کے سامنے بھی یہ لوگ دل کی کھڑکیاں بند رکھتے ہیں۔

آئیے ایک اور آیت پڑھیں: وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ (س۔ حج، آیت ۵،۶) اور تو زمین کو مردہ (افتادہ) دیکھ رہا ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو لہلہانے اور ابھرنے لگتی ہے اور ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے تو (یہ قدرت کے تماشے اس لئے دکھاتے ہیں تاکہ تم جانو) کہ بے شک خدا برحق ہے اور (یہ بھی کہ) بے شک وہی مُردوں کو جلاتا ہے، اور وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے ــــــــ اس آیت میں جو تعبیر کی گئی ہے وہ منکروں کو موہ لیتی ہے کیونکہ زمین کو مردہ کہا گیا ہے جس میں کوئی درخت نہیں ہے اور گویا کہ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بڑے بڑے درختوں کی گٹھلیاں یا سرسبز ٹہنیوں اور پھولوں اور پتوں سے لدے ہوئے نباتات کے

بیج کے اندر زندہ خلیہ ہوتا ہے جس کے اندر مستقبل میں ہونے والے تغیرات وحرکت ونشاط کی صلاحیت واستعداد رہتی ہے۔

یہ خلیہ رکن اساسی ہے بالقوۃ اس کے اندر جو امکانیات ہوتے ہیں ان سے یہ متمتع ہوتا رہتا ہے اور اس کے آس پاس جو مخصوص ظروف محیط ہیں ان کی وجہ سے وہ غیر فعال مرحلہ میں رہتا ہے۔ لیکن جب وہ سیراب ہو جاتا ہے اور فطری عوامل کی کثرت ہو جاتی ہے تو وہ منظم و مستمر طریقہ سے اپنی نمو کی ابتدا کرتا ہے۔

اور خود یہ مردہ مٹی اس خصوصیت کی وجہ سے متمیز ہے یہ بیج و تنا و پتوں کا جزو بنجاتی ہے نباتات اور اشجار کے جسم میں اس کی شکل بدل جاتی ہے اور پھر اس میں بکثرت زندہ خلایا ہوتے ہیں۔ اور مٹی کی یہ بدلی ہوئی صورت ہم مختلف شکلوں میں دیکھتے ہیں۔ پس گویا زندگی سے محروم زمین یہاں پہنچ کر زندہ موجود کی صورت میں بدل جاتی ہے اور یہ بہترین و بلیغ تعبیر ہے مولائے کائنات فرماتے ہیں: مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو نشأۃ اولیٰ کو دیکھتے ہیں۔ اور پھر بھی نشأۃ آخرۃ کا انکار کرتے ہیں (۱) حضرت اپنی حیرت کا اظہار ان غافلین کے لیے فرما رہے ہیں جو ایسی چیزوں سے جو عبرت و نصیحت سے پر ہوتی ہیں۔ بغیر استفادہ کے گزر جاتے ہیں ـــــ اسی طرح قرآن ـــــ جس کی تاثیر غیر محدود ہے اور جو اسرار عالم کے حل کی کنجی ہے ـــــ ہمیں بچوں کی پیدائش کا ذکر کرکے لوگوں کی نظروں کو معاد کی طرف متوجہ کر رہا ہے: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ

---

(۱) غرر الحکم، ج ۱ ص ۴۹۳

لِنُبَيِّنَ لَكُمْ ۚ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ۖ وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ۔

(س الحج الآیة ۵)

لوگو اگر تم کو (مرنے کے بعد) دوبارہ جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہے تو اس میں شک نہیں کہ ہم نے تمہیں (شروع شروع) مٹی سے اس کے بعد نطفہ سے اس کے بعد جمے ہوئے خون سے پھر اس لوتھڑے سے جو پورا (رشد والا) ہو یا ادھورا ہو پیدا کیا تاکہ تم پر اپنی قدرت ظاہر کریں (پھر تمہارا دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے) اور ہم عورتوں کے پیٹ میں جس (نطفہ) کو چاہتے ہیں ایک مدت معین تک ٹھہرا رکھتے ہیں۔ پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ (پھر تمہیں پالتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور تم سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو (بڑھاپے سے پہلے) مر جاتے ہیں اور تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو ناکارہ زندگی (بڑھاپے) تک پھیر لائے جاتے ہیں تاکہ سمجھنے کے بعد سٹھیا کے کچھ (خاک) نہ سمجھ سکیں

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَاءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝ إِنَّهُ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ (س الطارق آیت ۵ سے ۸) تو انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے، وہ اچھلتے ہوئے پانی (منی) سے پیدا ہوا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے بیچ سے نکلتا ہے۔ بیشک خدا اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قدرت رکھتا ہے ——

یہ سب جانتے ہیں کہ انسان کا تغذیہ مختلف کھانوں اور مواد ترابیہ کے نچوڑ —— یعنی نباتات، گوشت، دودھ —— سے مکمل ہوتا ہے جسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ان مواد کا بنیادی دخل ہے۔ اس بنا پر نطفہ —— جو معین مراحل طے کر کے انسانی صورت میں ظاہر ہوتا ہے —— مٹی کی ایک متحول صورت ہوتا ہے۔ اور وہ وہی مولود ہے، جو

اپنے مخصوص مقام کی وجہ سے تمام ظواہر میں ممتاز و متمیز ہوتا ہے اور یہ منزلت اسے تخفیف و ترشیح قوت کے طفیل حاصل ہوتی ہے۔ اب یہی مردہ مٹی کا نطفہ کی طرف پھر انسان کی صورت میں ظاہر ہونا "مردہ سے زندہ کے نکلنے" اور بعث و نشور کے موضوع کو واضح و ثابت کرتا ہے۔ اور اس طرح کلام خدا کی حقیقت کا واضح طور سے ادراک کر سکتے ہیں۔ جس میں ارشاد ہوتا ہے: مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (س طٰہٰ آیت ۵۵) ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا اور مرنے کے بعد اسی میں لوٹا کر لائیں گے اور اسی سے دوسری بار (قیامت کے دن) تمہیں نکال کھڑا کریں گے

عالم رحم میں بچے کا پے در پے تحول اور شدید الغرابۃ مراحل کا قطع کرنا اور اس کے آگے کی طرف چلا جانا، یہ تمام چیزیں ان عجیب تر حوادث میں شمار ہوتی ہیں جو بچے کے پیدائش عالم خلق میں پیش آتی ہیں۔ اور بچہ ان مراحل کو جان کی داخلی قوت کے ماتحت بڑی خوش اسلوبی سے طے کرتا ہے اور اس کے راستے میں جتنے موانع ہوتے ہیں ان سب کا ازالہ کرتا جاتا ہے۔ انسان کی حکومت و دخل اندازی کے بغیر وہ اپنے راستے کو طے کرتا رہتا ہے۔

اور حالانکہ جنین کے خلایا اپنے مختلف مراحل میں متشابہ ہوتے ہیں اور کوئی ایسی علامت بھی نہیں ہوتی جس سے پتہ چلے یہ ثقیل خلیے انسان کے کس عضو کی طرف پلٹیں گے۔ لیکن اتفاقی تغیرات متشابہ خلیوں کے اندر ان خلیوں کو ایجاد اعضاء کا اہل بنا دیتے ہیں۔ اور ہمیں ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ ان ظواہر کے حدوث و ظہور کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔

مخلوط اور مجتمع خلیے جو اپنی جگہ پر مستقر ہیں وہ ایک دوسرے سے منفصل ہوتے ہیں۔ اور جو خلیہ جس عضو کے لئے مخصوص ہوتا ہے وہ اسی کا رخ کرتا ہے اور انہی خلیوں کے طفیل جسم اپنے اعضاء کی معین صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور جب انسانی جسم کی ساخت مکمل ہو جاتی ہے تو قادر مطلق اس جسم میں روح پھونکنے کا انتظام کرتا ہے جو ابھی تک بے روح

تھا۔ اور اس طرح ایک دوسرا قیمتی عنصر عالم وجود میں آتا ہے۔

مشہور فرانسیسی مفکر ڈاکٹر الکسیس کارل (ALEXIE CARL)

جنین کے خلیے کے عجائب کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ہمیں معلوم ہے کہ ابتدا انسانی جسم ایک خلیہ پر مشتمل ہوتا ہے پھر نمو کے دوران دو خلیوں میں منقسم ہو جاتا ہے اور یہ دونوں بھی دو خلیوں کی طرف منقسم ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ تقسیم برابر جاری رہتی ہے یہاں تک کہ انسان کا مطلوب پورا ہو جائے۔

حالانکہ جنین اپنے نمو کے دوران ہر لحظہ من حیث الترکیب پیچیدگی کی طرف بڑھتا ہے بلکہ اپنے لباطت عمل میں "بذرۃ اساسیۃ" کو محفوظ رکھتا ہے اور وہ خلیے جو ان لاتناہی خلیوں کے درمیان ہوتے ہیں جو جسم اعضو کی تخلیق کرتے ہیں وہ کبھی اپنی وحدت اصلی کو فراموش نہیں کرتے۔ اور یہ پہلے ہی سے جانتے ہیں کہ جسم کے اندر انہیں کون سا وظیفہ پورا کرنا ہے پھر ہر عضو کی تخلیق مخصوص طریقے سے ہوتی ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ خلیوں سے بنی ہوئی عمارت میں جو مواد استعمال ہوتے ہیں وہ گھروں کی تعمیر میں لگنے والے مواد کے مشابہ نہیں ہوتے بلکہ خلیوں میں تو در حقیقت کوئی عمارت نہیں ہوتی اگرچہ اتنی بات کہی جاتی ہے کہ جس طرح اینٹوں سے گھر بنتے ہوتے ہیں اسی طرح خلیوں سے جسم بنتا ہے لیکن ان دونوں کی تشبیہ کے لئے ہمیں ایک ایسا گھر فرض کرنا پڑے گا جو صرف ایک اینٹ سے بن گیا ہو ——— جیسے جسم ایک خلیہ سے بنتا ہے ——— وہی ایک اینٹ ایسی ہو جو نہر کے پانی اور اس کے معدنی شدہ پن اور فضاء میں بکھرے ہوئے غازات سے متعدد اینٹیں بنائے۔ پھر بغیر کسی نقشہ یا معمار کے ایک دوسرے پر رکھتی چلی جائے

اور دیواریں بلند ہو جائیں اور پھر اپنی سے شیشے کی کھڑکی، چھت، مطبخ، غسل خانہ وغیرہ بنانے
مختصر یہ کہ ترکیب عضوی کی گفتگو ان قصے کہانیوں جیسی ہوگی جو بچوں کو سنائی جاتی ہیں ۔[۱]

اور یہ یقیناً عجیب بات ہے کہ خداوند عالم اس زندہ خلیہ سے جو رحم میں پڑا ہوا ہے اور جس میں سریع تحولات ہوتے رہتے ہیں انہیں تحولات کے درمیان اس سے ایک ایسا انسان پیدا کر دے جو متناسب اعضاء والا ہو اور اس کے جسم میں ایسے متعدد آلات ہوں جو ذاتی طور سے عمل کرتے ہوں ـــــــ تو کیا ان تمام باتوں کے باوجود موت کے بعد جو ذرات ہر طرف بکھرے ہوتے ہیں انہیں واپس لاکر انسان کی پہلی شکل و صورت عطا کرنے سے خدا عاجز ہے؟ حالانکہ یہ سارے ذرات ایک ہی شئے ہیں اور ان کا منبع بھی ایک ہے اور کیا جو شخص جنین کے محیر العقول حالات کو دیکھ رہا ہو وہ دوبارہ زندگی کے امکان کا منکر ہو سکتا ہے؟ اور کیا مردوں کو زندہ کرنا جنین کی خلقت سے زیادہ پیچیدہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

اس لئے کہا جاتا ہے کہ واقعات کا ادراک کرنے کے لئے مسائل پر سطحی نظر نہیں ڈالنی چاہیئے اور معمولی کوشش کر کے ٹھہر جانا چاہیئے بلکہ دہشت زدہ کرنے والے وہ حقائق جو پورے عالم پر مسلط ہیں ان میں بہت ہی غور و فکر کرنی چاہیئے اور کھلے ذہن، عقل تدبر اور گہرائی سے مشاکل کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

حیوانات کے سلسلے میں اگر اجزائے وجود میں نقص پیدا ہو جائے تو اسے متعدد مرتبہ درست کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً بعض اپنے شکم پر چلنے والے جاندار اگر ان کے عضو کا کوئی جزو یا اعضاء میں سے کوئی عضو مفقود ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا جزو یا عضو

---

[۱] انسان موجود ناشناختہ ص ۱۰۳، ۱۰۴، چونکہ عربی ترجمہ "الانسان ذالک المجہول" نہ مل سکا اس لئے فارسی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

لگایا جاسکتا ہے بلکہ بعض کیڑے تو ایسے ہیں کہ اگر ان کے کئی ٹکڑے کر دیئے جائیں تو ہر ٹکڑا ایک کامل کیڑا بن جائے گا۔[1]

یہ بات صحیح ہے کہ اس قسم کی ترمیم انسان کے یہاں نہیں ہوسکتی۔ لیکن جب ظروف اور اسباب مہیا ہو جائیں گے تو یہ بھی ممکن ہے کیونکہ ایک ذرہ سے انسانی بدن کا نو غیر ممکن نہیں ہے جیسے کہ ایک جزو صغیر سے بڑے بڑے درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمارے مشاہدہ میں یہ بات ہے کہ ظرف رحم اس عمل کو بڑی خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ یہ رحم ایک خلیہ کی نشوونما کچھ اس طرح کرتا ہے کہ وہ آگے چل کر ایک انسان بن جائے اور حد کمال تک پہنچ جائے۔

جب گلاب کے ایک بیج میں پھول کے تمام اسرار چھپے ہوتے ہیں اور بیج مناسب حالات کے باہم ہونے پر اپنی خوشبو سے دل و دماغ معطر کر دیتا ہے تو پھر ایک زندہ خلیہ کے اندر بھی یہ صلاحیت ہے کہ اپنے اندر کامل انسان کی خصوصیات کو چھپائے ہو اور پھر مناسب حالات میں اسے مکمل انسان بنا دے۔

امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا: کیا میت کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے؟ فرمایا: ہاں یہاں تک کہ ہڈی و گوشت بھی ختم ہو جاتا ہے صرف اس کی وہ مٹی جس سے اُسے خلق کیا گیا تھا قبر کے اندر مستدیر صورت میں باقی رہ جاتی ہے جس سے پھر دوبارہ خدا انسان کو پہلے کی طرح پیدا کرتا ہے۔[2]

قرآن مجید بھی بڑی صراحت کے ساتھ خدا کی غیر محدود قدرت کو بیان کر رہا ہے

---

[1]: علم و زندگی (العلم والحیاۃ) ص ۴۲

[2]: فروع کافی جزو ۳، ص ۲۵۱

اور منکرین کو نظام وجود کے بارے میں عمیق ترین تفکر کی طرف دعوت دیتا ہے اور وہ صرف صاحبان تعقل ہی کو موضوع بعث کے ادراک کا اہل سمجھتا ہے چنانچہ کہتا ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ.

(س قیامت آیات ۳۶ تا ۴۰)

کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ (ابتدا میں) منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو رحم میں ڈالا جاتا ہے پھر لوتھڑا ہوا پھر خدا نے اسے بنایا پھر اسے درست کیا پھر اس کی دو قسمیں بنائیں (ایک) مرد اور (ایک) عورت کیا وہ اس پر قادر نہیں ہے کہ قیامت میں مردوں کو زندہ کرے۔

تمام دنیا و ما فیہا کے اسرار پر ایک گہری علمی نظر ڈالنے سے اور قدرت الہی کے غیر محدود ہونے پر ایمان رکھنے سے معاد کا موضوع اور دوبارہ زندگی کا مسئلہ عقل کے نزدیک واضح ہو جاتا ہے۔ اور اگر ہم یہ دیکھیں کہ بشری علم محدود ہے خصوصاً وجود کے مختلف ابعاد کے بارے میں تو معلومات بہت کم ہیں تو اس وقت ہمیں پتہ چلیگا کہ موجودہ عصر ذرہ و نور اپنی عظمت و جلال کے باوجود تمام مشکلات کا حل نہیں پیش کر سکتا۔

لیکن انسانی عقل و سماعت و بصارت جس کی فکر محدود ہے وہ واقعات کے ادراک سے قاصر ہے خصوصاً جب انسان میں روح عناد بھی موجود ہو۔

ہم اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے چھوٹے سے کرۂ ارضی ـــــــ جو عالم وجود کے ابعاد عظیمہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے ـــــــ پر مظاہر حیات کی تنوع کس حد تک ہے۔ حد یہ ہے کہ کرۂ ارضی پر کیفیت حیات اور اس کے جاندار

آلات تک ہمارے لئے مجہول ہیں۔ لہٰذا معاد کے منکرین بالکل اندھے ہو کر معاد کی نفی نہ کریں اور کم از کم انہیں بطور احتیاط اور چشم و جزم سے خالی حکم لگانا چاہیئے ——
ہمارے ارد گرد جو واقعات ہیں وہی قدرت الٰہی کی تھوڑی کا بہت معرفت کا سبب بن جاتے ہیں اور قدرت الٰہی کی معرفت کے بعد ہم کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ بعث اور احیاء موتیٰ کا موضوع اس پیچیدہ منظم کائنات سے زیادہ عجیب نہیں ہے۔

قرآن کہتا ہے، وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيهِمَا مِنْ دَابَّةٍ وَهُوَ عَلَىٰ جَمْعِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ (سورہ الشوریٰ آیت ۲۹) اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے سارے آسمان و زمین کا پیدا کرنا ہے اور جانداروں کا بھی جو اس نے زمین و آسمان پھیلا رکھے ہیں اور جب چاہے ان کے جمع کر لینے پر (بھی) قادر ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے، أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ ۚ بَلَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۔ (س احقاف۔ آیت ۳۳) کیا ان لوگوں نے یہ غور نہیں کیا کہ جس خدا نے سارے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے ذرا بھی تھکا نہیں۔ وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کرے گا۔ ہاں (ضرور) وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔

لہٰذا جس نے وجود کو اس کے تمام عجائب کے ساتھ خلق کیا اور ہر چھوٹا بڑا اسکی دائمی عدالت کے سامنے سرنگوں ہوا۔ اور جس نے بعض موجودات کو حیات بھی بخشی وہ یقیناً مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ کیونکہ مُردوں کا زندہ کرنا تمام موجود کے خلق سے سہل ہے اور عقل انسانی کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی موجود کے متفرق اجزاء کو جمع و ترتیب دینا

اس موجود کے خلق و ایجاد سے آسان تر ہے۔ اسی طرح صنعتی آلات کے اجزاء کو جمع کرنا زیادہ آسان ہے یا ان آلات کو خلق کرنا؟ ظاہر ہے کہ اجزاء کو اکٹھا کر دینا آسان ہے یہیں سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ ابتداء میں مٹی سے خلق کرنے والے خدا اور پھر ایک زندہ خلیہ کے واسطے سے نسلِ انسان کو حیات بخشنے والے خدا کے لئے بلاکسی شک اور شبہ کے مرنے کے بعد اور اجزاء کے متفرق ہو جانے کے بعد دوبارہ انسان کو پیدا کرنا بہت آسان ہے۔

پس جس طرح اس نے ایک ایسے خلیے کو جو آنکھ سے نہیں دکھائی دیتا کروڑوں خلیوں اور ہڈیوں، جلد اور گوشت میں بدل کر ایک کامل انسان بنا دیا۔ وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ پھر سے متفرق اجزاء کو جمع کر کے زندگی دے دے۔

خلقت انسان کے بارے میں ہماری معلومات بس اتنی ہیں کہ ایک فرد سے ایک فرد پیدا ہوتا ہے لیکن خدا تو خلقت کی تمام تفاصیل سے واقف ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ۔ (س یٰسین آیت ۷۹) وہ ہر طرح کی پیدائش سے واقف ہے۔

اور وہی غیر محدود قدرت ہے جس نے پہلے موجود کو ولادت کے بغیر پیدا کیا ہے اور قرآن ان حقائق کی تفصیل بیان کرتا ہے: أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُمْنُونَ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ عَلَىٰ أَنْ نُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ (س واقعہ، آیت ۵۸ تا ۶۲) کیا جب نطفہ کو تم اعورتوں کے) رحم میں ڈالتے ہو کیا تم نے دیکھ بھال لیا ہے کیا تم اس سے آدمی بناتے ہو یا ہم بناتے ہیں۔ ہم نے تم لوگوں میں موت کو مقرر کر دیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں

www.kitabmart.in

ہیں کہ تمہارے ایسے اور لوگ بدل ڈالیں اور تم لوگوں کو اس (صورت) میں پیدا کریں جسے تم مطلق نہیں جانتے اور تم نے پہلی پیدائش تو سمجھ لی ہے کہ ہم نے کی (پھر تم غور کیوں نہیں کرتے ——

یہ آیات خدا کے اس ارادہ و مشیت کا تذکرہ کر رہی ہیں جس نے انسان کو مختلف مراحل سے گزار کر حد کمال کو پہنچا دیا۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ یہ تمام مراحل صرف اللہ کے ارادے سے پورے ہوتے ہیں اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ وہی خدا ہے جو ہمیں پیدا کرتا ہے اور جب شئون کا ارادہ کرتا ہے پھر کسی سے مشورہ یا مدد طلب کئے بغیر ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

بس تو وہی ارادۂ الٰہی اور قوت لا متناہی جس کے سامنے انسان اپنے نشو و کمال میں محتاج ہے وہ اس انسان کو دوبارہ خلق کر سکتا ہے۔

قرآن اعلان کرتا ہے: وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (س روم آیت ۲۷) اور وہ ایسا (قادر مطلق) ہے جو مخلوقات کو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ (قیامت کے دن) پیدا کرے گا اور یہ (دوبارہ پیدا کرنا) اس کے لیے بہت آسان ہے۔ دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (س المومن آیت ۵۷) یعنی سارے زمین و آسمان کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے کی بہ نسبت یقینی بڑا (کام) ہے۔ مگر اکثر لوگ (اتنا بھی) نہیں جانتے۔

انہیں اسباب کی بنا پر موت انتہائے حیات نہیں ہے

وجود روح اور اس کے استقلال پر اس عنوان سے اعتقاد ممکن ہے کہ روح موضوع مُشا اور عالم ما بعد الموت پر بہت ہی مضبوط دلیل ہے۔

تجربہ کار علماء نے روح کے سلسلہ میں متعدد خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن فلسفی بحثوں کا دامن جتنا وسیع ہوتا گیا اور علوم کا انتشار جتنا زیادہ ہوتا گیا اور ثقافت کی وسعت جتنی جتنی بڑھتی گئی اتنی ہی اثبات روح اور تجرد روح کی علامات واضح تر ہوتی گئیں اگرچہ ہم اب تک اس کی ماہیت کی توضیح میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے اور نہ ہی اس عنصر خالد کے تمام پیچیدہ اسرار سے پردہ اٹھا سکے۔

اس لئے قرآن بھی روح کی ماہیت کو حقیقت غیر معروفہ بنا کر پیش کرتا ہے اس طرح کہ انسان بطور وقت اس کی معرفت سے عاجز ہے۔ چنانچہ جب رسول اسلامؐ سے حقیقت روح کے بارے میں پوچھا گیا تو قرآن جواب دیتا ہے: وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (س الاسراء آیت ۸۵) اور (اے رسولؐ) تم سے لوگ روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، تم (ان کے جواب میں) کہدو کہ روح (بھی) میرے پروردگار کے حکم سے (پیدا ہوئی) ہے اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے (تم اس کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے)

آج قرآن کے جواب کو چودہ سو سال گزر گئے ہیں اور رسول خداؐ کے زمانے کی بہ نسبت علم بشر بہت ہی ترقی کر گیا لیکن اس میدان میں کسی بنیادی چیز کا اضافہ نہیں ہو سکا۔ اور بشری عقل کے لئے روح کی ماہیت آج بھی مجہول ہے۔ اور کوئی شخص اسے

وضاحت سے نہیں بیان کر سکا۔ اور جب تصریح قرآن آج تک مبہم و غامض ہے اور نہ ہی یہ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں کوئی ایسا دن آئے گا جب یہ ابہام دور ہو جائے گا۔

مشہور عالم ہنری برگسون HENRI BREGSON

کہتا ہے: "افلاطون کی طرح پہلے میں بھی نفس کی تعریف کروں گا۔ یہ سمجھ کر کہ نفس چونکہ بسیط ہے اس لئے قابل تحلیل نہیں ہے اور چونکہ غیر منقسم ہے اس لئے فاسد نہ ہوگا اور فطری طور سے دائمی ہے ـــــ اس کے بعد ہم استنتاج کے راستے سے اس بات کی طرف منتقل ہوں گے کہ آیا نفس زمانہ میں ہبوط کر سکتا ہے! پھر ابدیت کی طرف عود کے بارے میں فکر کریں گے۔ لیکن جو شخص اس طرح النفس المعروف کے وجود ہی کا منکر ہو تو تم اس سے کیا کہہ سکو گے؟ اور جو مسائل نفس واقعیہ اور اس کے اصل واقعی اور انجام واقعی سے متصل ہیں تم ان کا حل کیونکر پیش کر سکو گے؟ بلکہ تم اس کو واقعی تعبیروں سے کیونکر پیش کر سکو گے۔ تم جو بھی فکر کا مفہوم فرض کر کے پیش کرو گے ہو سکتا ہے وہ خالی ہو یا تم اتفاقی طور سے کسی ایسے کلمہ کی وضاحت کرو گے جس کو معاشرہ نے سہولت کلام کے لئے واقع کے صرف ایک جزو کے لئے وضع کیا ہو (دیکھیے) تقریباً ہمیشہ بانجھ پن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر تعریف اتفاقی نہ ہو۔ مفہوم افلاطونی کو دو ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی اس نے نفس کے مفہوم میں بال برابر بھی ترقی نہیں کی۔[1]"

---

[1] : منبعا الاخلاق والدین ص ۲۸۰

انگریزی محقق ڈاکٹر چیسر DR. CHAUSER

کہتا ہے، بعض لوگ کہتے ہیں دماغ کے مجموعی میکانیکی افعال انا یا ذات کی تشکیل دیتے ہیں اور دوسروں کا کہنا ہے کہ وہ دماغ اور اس چھپے ہوئے شرارہ کا نام ہے جو موت کے وقت بدن سے نکلتا ہے (یعنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے) آپ حضرات کو معلوم ہے کہ فلسفیوں نے روح، اس کی ماہیت اور بدن میں اس کی جگہ اور یہ کہ وہ معدوم ہونیوالی ہے یا باقی ہے اس کے بارے میں بہت غور کیا ہے اور بڑی بحثیں کی ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کا آخری حل نہیں معلوم ہوسکا اور علماء آج تک اس کے حل کی تلاش میں ہیں۔

آخری زمانے میں جب مفکرین نے پہلے[1] روح کے موضوع پر دوسرے زاویہ سے بحث کریں گے یعنی موضوع روح کہ جو بہت پیچیدہ اور غامض ہے اسے ایک طرف کر کے صرف نفس یا ذہن کے بارے میں بحث کریں گے۔ یعنی عواطف و عقائد و افکار کے بارے میں صرف بحث کریں گے۔

اور یہ واقعہ ہے کہ جب انسان اس بات کی طرف متوجہ ہوا کہ معرفت روح کے میدان میں اس کی تمام کوشش ناکام ہوگئی تو پھر وہ اپنے کو اس بات کی تصدیق سے کیونکر روک سکتا ہے کہ یہاں ایک مخفی بھید ہے جو ہمیں تسلیم و تعظیم پر آمادہ کرتا ہے۔

آپ کو کوئی ایسا شخص نہیں ملے گا ——— حد یہ ہے کہ مادی حضرات جو عقیدہ اور رائے میں مذہبی حضرات سے بنیادی اختلافات رکھتے ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں ———

---

[1] رشد و زندگی (النمو والحیاۃ) صفحہ ۱۳۴

جو اس حد تک انکار کر سکے اور حقیقتِ روح کو قبول کرنے ہی سے انکار کر بیٹھے بلکہ یہ حضرات
بھی علم نفس اور طب نفسی جیسے علوم کا اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن بنیادی فرق مادی علماء
اور مذہبی علماء ـــــ مذہبی علماء کے ساتھ حیات بعد الموت پر عقیدہ رکھنے والے فلسفی حضرات
بھی ہیں ـــــ کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہبی علماء کا عقیدہ ہے کہ ایک ایسی حقیقت
بہرحال موجود ہے جو تمام وجود انسانی کو شامل ہے مگر وہ جسم مادی اور حقائق مجردہ سے
الگ چیز ہے جس کی ماہیت مخصوص ہے اور جو انسان میں تدبر و تفکر کا مرکز ہے۔ اس
کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جسم و روح واقع میں ایک دوسرے سے جدا ہیں اس طرح کہ ان
میں سے ہر ایک الگ الگ مستقل ہے بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں حقیقتیں
مرتبط ہیں اور عین اس حال میں دو مختلف ماہیت ہیں۔

البتہ مادی فلسفی حضرات کا نظریہ اس بات پر ہے کہ مادہ سے الگ ہو کر کوئی مستقل
جوہر روح نام کا نہیں ہے اور وہ لوگ اس بات پر مصر ہیں اور اس کے مدعی ہیں کہ دماغ
کے تمام نشاطات اور آلات مادی قوانین کے تابع ہیں اور یہ سب خلایائے مخ اور خلایائے
عصبیہ کے کیمیاوی انفعالات اور فیزیائی آثار ہیں ـــــ یعنی ہمارے عصبی مجموعے
اپنے تمام ادراک کو بحیثیت عضو مرکزی ـــــ مخ ـــــ تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ ہمارے
ادراکات ایک مجموعہ کی شکل میں ہوتے ہیں جن کا ایک دوسرے سے تشخیص ممکن نہیں
ہے۔ اور ظواہر روحیہ سوائے ان نشاطات الفیزیائیہ الکیمیاویہ کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔
اور جس وقت دماغ کے خلیے تحلیل و منتشر ہو جاتے ہیں اور اجزائے بدن کے درمیان
متبادل تاثیرات کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اور خلیے حرکت و توالد سے متوقف ہو جاتے
ہیں تو حقیقت انسان سے صرف جسد مادی باقی رہ جاتا ہے اور اسی لئے بقائے روحی اور
مستقل واصیل وجود جوہری جو غیر طبیعی خاصے سے متمیز ہو اس کی کسی بھی رنگ بقائے تعلق

ناممکن ہو جاتی ہے۔ اور یہ عدم تصدیق اس وجہ سے ہے کہ ظہور موجودات اور ان کی بقاء کی کیفیت مادہ زمانی ومکانی کے ارتباط کا معلول ہوتا ہے۔

اور یہیں سے مذہب الٰہی مادی مذہب سے الگ ہو جاتا ہے اور ہر ایک اپنے مخصوص طریقہ کا پابند ہو جاتا ہے ———— لیکن اگر ہم مادیین کی باتوں کی تصدیق کریں تو پھر انسان مختلف وسایل وآلات کا مرکب ہوا عمل ہے اور جس وقت اس کے مادۂ جسم کے اجزاء کے درمیان متبادل تاثیرات کا فقدان ہو جائے گا۔ تو آثار تفکر وحیات بالکلیہ معدوم ہو جائیں گے۔ اور مادی حضرات کے اس کلام میں نہ تو روح بشری کی حقیقت کی تفسیر ممکن ہے اور نہ خود حقیقت انسان کی تفسیر ممکن ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جسم قوانین فزیالوجی کے تابع ہے۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ انسان مکمل طریقہ سے مادی قوانین سے مربوط ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ظواہر روحیہ اور خلایائے مخ کے درمیان ایک ایسا علاقہ موجود ہے کہ اس عالم میں مجرد وسایل واسباب کے بغیر روح کسی بھی نشاط پہ قادر نہیں ہے، دماغ — مخ — کے خلیے اعصاب اور افعال اور دماغ کے کیمیائی انفعالات یہ سب چیزیں روح کے وسایل ہیں اور روح اپنے تمام نشاطات کی انجام دہی انہیں وسایل سے کرتی ہے۔

اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روح اور اس کے تمام نشاطات ———— مثلاً ارادہ، تصمیم، ادراک ———— مادہ سے الگ مستقل واقعیات ہیں یا خالص مادی حقایق ہیں جو تمام ظروف وحالات میں مادی قوانین کے تابع ہوتے ہیں؟ مثلاً اگر ہم ٹیلیفون کے ذریعے کسی دور رہنے والے شخص سے باتیں کریں تو اصلی سننے والا ٹیلیفون کے

لہ: ساخت جسم کی سائنس

آلات ہیں یا ہم ہیں؟ اور یہ ٹیلیفون ہماری گفتگو کے لئے ذریعہ و وسیلہ ہے اور اس
کے واسطے سے ہم تک آواز پہنچتی ہے یا حقیقی فاعل اور واقعی سننے والا ٹیلیفون ہے؟
بالکل اسی طرح دماغ کے خلیے افعال روح کے لئے وسیلہ ہیں نہ یہ کہ وہ خالق روح ہیں۔
مادی حضرات اپنے نظریہ کے اثبات کے لئے جتنی بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں ان سے صرف
اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانی ادراکات اور دماغ کے خلیوں میں کوئی علاقہ ہے جس سے یہ
بات ثابت ہوتی ہے کہ دماغ ہی ادراکات کے تمام افعال انجام دیتا ہے اور مذہبی علما بھی اس
بات کے ہرگز مدعی نہیں ہیں کہ دماغ کے خلیوں کی تاثیر کے بغیر تفکر کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔

ادراک یا شعور اور افعال، وہ کیمیائی انفعالات جو دماغ کے اندر مکمل ہوتے ہیں ان کے علاقہ
کے اثبات کے لئے مادی علماء نے جن تجرباتی علوم اور تجربوں کا سہارا لیا ہے ان سے صرف اتنی
بات ثابت ہوتی ہے کہ تحقیق ادراک اور حالات نفسیہ ہیں اعصاب اور دماغ کا احساس دور اور
موثر کردار ہے۔ لیکن ان تجربوں کا نتیجہ کسی بھی حال میں نہیں نکلا کہ انھیں وسائل اور کیمیاوی و فیزیائی
آثار ہی کا نام روح و نفس ہے۔ آخر میں اتنی بات عرض کردوں کہ ادراک و شعور کے خصائص
کی توضیح کے لئے اس قسم کے علاقہ کا اثبات ناکافی ہے۔

ہم یہاں روح کی تشبیہ کے لئے اس برقی قوت کی مثال دینا چاہتے ہیں جو کسی بجلی
کی مشین وغیرہ میں استعمال کی گئی ہو کہ جس وقت اس مشین سے برقی رو ختم ہو جائے گی
وہ مشین ظاہری موت کا شکار ہو جائے گی، حالانکہ اس کے تمام کل پرزے بالکل ٹھیک
ہیں اور ان میں کوئی عیب یا نقص نہیں ہے۔ مگر بجلی کے ختم ہوتے ہی وہ مشین گویا مر جائیگی۔

اسی طرح بدن سے جب روح کا علاقہ ختم ہو جاتا ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ لیکن اس روح
کے علاقے کے ختم ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ روح فنا ہو گئی یا معدوم ہو گئی
جیسے آپ کے ہاں ٹیلیفون یا ریڈیو اور ٹیلیویژن میں کوئی خرابی ہونے سے نہ گفتگو سنائی دیتی

ہے اور نہ آواز آتی ہے نہ ٹیلیویژن پر کوئی صورت دکھائی دیتی ہے کیونکہ ارتباط وسیلہ خرابی کی وجہ سے ختم ہوگیا، حالانکہ آواز اور صورت دوسری تمام جگہوں پہ سنائی اور دکھائی دے رہی ہے۔ لیکن آپ محسوس نہیں کرسکتے کیونکہ آپ کے ہاں کوئی خرابی ہے آپ اس وقت سن سکیں گے اور دیکھ سکیں گے جب دوبارہ وہ خرابی دور ہو جائے۔

پس جس طرح ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیویژن میں خرابی پیدا ہونے سے آواز اور صورت اپنی جگہ مستقل رہتی ہیں اسی طرح انسانی روح اپنے تمام کام انجام اس وقت دیتی ہے جب تک وہ بدن سے متعلق رہے۔ لیکن اگر بدن میں خرابی کی وجہ سے بدن سے الگ ہو جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روح ختم و معدوم ہوگئی۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ بدن میں مختلف جوانب اور تقریباً مشابہ کامل بنیادی طور سے دماغ کے عمل سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً گردوں اور باقی اعضاء کا عمل فزیائی اور کیمیائی انفعالات سے تکوین پذیر ہوتا ہے۔ اور اس کا عمل داخلی نظام سے متعلق ہوتا ہے جبکہ ظاہر روح کا تعلق صرف نظام خارجی اور ہمارے وجود سے منفصل طور سے متعلق ہوتی ہے۔ اور یہ بات یقینی ہے کہ عالم خارجی بذات خود ہمارے اعماق وجود میں مداخلت نہیں کرتا بلکہ حالت علم میں موجودات خارجیہ کا احاطہ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور دماغ کے خلیے اس قسم کی مہم جوئی انجام نہیں دے سکتے۔

اور یہ خلیے دیگر اعضاء کے بدن کی طرح خارج سے چاہے جتنا متاثر ہو جائیں لیکن ان میں خارجی امور کی معرفت کی صلاحیت نہیں ہوتی اور اگر ایسا ہوتا تو ہم معدہ یا آنتوں کے ذریعے اشیاء خارجیہ کا ادراک کر لیا کرتے۔ اسی لئے ہمارے ادراکات کے خصائص سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے وجود پر کوئی دوسری حقیقت حکومت کرتی ہے۔

ہم جس وقت حق و باطل میں تمیز کرتے ہیں اور جمال و بدصورتی میں فرق کرتے ہیں تو گویا ہم خارج کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں اور اس کا قیاس اپنے معیار سے کرتے ہیں گویا ہم

پس ایک ایسی قوت ہے جس کے ذریعے حق و باطل، صحیح و غلط کے بارے میں تمیز کر لیتے ہیں اور اسی کا دوسرا نام "حقیقت روح" ہے کیونکہ تمیز کر کے حکم لگانا ہمارے اعصابی نظام سے خارج ہے اور اس کا منبع تفکر اور نشاط ذہنی ہے اس کی تفسیر حس و تجربہ سے کرنا بھی ناممکن ہے۔

یہ غیر مرئی نور جو ہمارے اعماق میں چھپا ہے اور جس کی بدولت ہم خیر و شر، حق و باطل، حسن و قبح کے درمیان تمیز پیدا کرتے ہیں یہ وہی واقع مطلق اور روح ابدی ہے جس کے ارد گرد تمام زمانی حوادث گردش کرتے ہیں اور یہ خود ایسا ثابت محور ہے جو کسی بھی قسم کی تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔

وحدۃ شخصی بھی ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمارے لئے روح کی حقیقت کا اثبات کرتی ہے۔ دیکھئے علم انسان کی دو قسمیں ہیں، ۱۔ ایک تو انسان کا خود اپنے وجود کا علم، ۲۔ دوسرے اپنے علاوہ دیگر موجوداتِ خارجیہ کا علم، اشیائے خارجیہ کا علم ان کی صورت کا ذہن میں حاصل ہونے سے ہوتا ہے جس کو "علم حصولی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اپنی ذات کے علم کے لئے حصول صورت کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ تو ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ انسان سے کبھی جدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے اسکو "علم حضوری" کہا جاتا ہے۔ علم حضوری ہمیشہ حاضر و مستمر رہتا ہے۔ اس میں عدم یا تحول کی کوئی صورت نہیں ہوتی یہ وعی و احساس و تشخیص میں دائم و ثابت رہتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لئے یہ علم واضح ترین معلومات میں سے ہوتا ہے۔

اور یہ حقیقت ایسے زوال و تغیر سے جو واقع خارجی کے صفات ہیں ان سے دور رہتی ہے اور بدن ترابی پر مسیطر رہتی ہے اور جو کسی بھی جبر و بیماری کے سامنے سرنگوں نہیں ہوتی اور جس کے اوپر ہم "انا" کا اطلاق کرتے ہیں اور یہی وہ واحد شئی ہے جو حیات کے ابتدائی مراحل سے لے کر عمر کے آخری لمحہ تک رہتی ہے ——— اور اسی کو وحدتِ شخصی کہتے ہیں

مترجم ـــــ اور اسی کے خلود کی بدولت انسان کے لئے خلود کا تحقق ہوتا ہے، اور مرتبۂ وجود کے لحاظ سے یہ ایسے افق پر رہتی ہے جو مادیات کے افق سے کبھی مساوی ہو ہی نہیں سکتا۔ پس ہر شخص اپنی زندگی کے تمام مراحل میں اسی وحدت شخصی کی حفاظت کرتا ہے۔

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ مخصوص حقیقت وہی دماغ کے خلیوں کے مجموعہ کا نام ہے! ایسا نہیں ہے!

ہم سب کے علم میں یہ بات ہے کہ تقریباً سات سال کے اندر دماغ کے تمام خلیے مکمل طور پر بدل جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ خارج سے پہنچنے والے غذائی مواد ہیں اور ان خلیوں میں بعض طاقت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ پرانے تحلیل شدہ خلیوں کی جگہ پر آجاتے ہیں (بلکہ) ہر زندہ موجود اپنی زندگی کے درمیان ان دائمی تغیر و تحول کی وجہ سے "جن سے یہ بدن کے جزئیات و ذرات بن جایا کرتے ہیں۔" متعدد مرتبہ ایسے خلیوں کی تبدیلی سے دوچار ہوتا ہے

اب اگر ہمارا وجود صرف انہیں مادی اجزاء میں منحصر ہوتا اور اس غیر مرئی قوت کا وجود نہ ہوتا جو تمام خلیوں پر اور بدن کے عمومی نظام پر حکومت کرتی ہے تو لازمی طور پر ہم ایسے ذاتی صفات سے متصف ہوتیں۔ اور ہم میں سے کسی کو یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ ہم وہی شخص ہیں جو آج سے دس سال پہلے تھے۔ کیونکہ اعصابی و دماغی آلات کے تمام خلیے اس مدت میں بدل چکے ہوتے ہیں۔ جیسے کہ جسم کے سارے اعضاء بدل جایا کرتے ہیں ـــــ لیکن ہم میں سے ہر شخص اس حقیقت کا احساس رکھتا ہے کہ پوری عمر ہم ہی رہے ہیں اور یہی غیر مرئی قوت انسانی شخصیت کی تشکیل کرتی ہے اور یہی ہمارے وحدت شخص کا راز ہے۔ پس اسی غیر مرئی قوت کو ہم روح کہتے ہیں۔

ہر انسان اپنے باطن میں غور و فکر کر کے اپنے اندر روح مجرد کے وجود کا ادراک کر سکتا ہے اور یہ روح مجرد اپنی نوعیت میں اپنے فزیائی وجود سے مختلف ہے، ہم میں سے ہر شخص

اپنے اندر ایک قسم کے استقلال و تشخیص واستمرار وحضور دوام کا احساس کرتا ہے اور یہ ساری چیزیں ہیں ـــــ استقلال، تشخیص واستمرار، حضور دوام ـــــ اس مادی وجود سے مناسبت نہیں رکھتیں جو بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر روز نئی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جو شخص جسم پر مسیطر ہے اور عدم کا اس کی طرف گزر نہیں ہے، وہ نہ مادی ہو سکتا ہے اور نہ مادی قوانین کے تابع ہو سکتی ہے۔

کرس موریسون MORRISON

کہتا ہے: چونکہ نظام عالم میں نظم وضبط قوانین کے مطابق دورہ کرتا ہے اس لئے اس کے بارے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ عالم اتفاقی طور سے وجود میں آگیا ہے۔

حیوانات کے درمیان عاقل ومفکر انسان کا ظہور بہت ہی فطری اور اس سے کہیں زیادہ گہرا ہے جتنا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ انسان کی خلقت مادی تحولات کی معلول ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ اس کی خلقت میں کوئی خالق ضرور ہے۔ اور ایسی صورت میں انسان ایک ایسا میکانکی آلہ ہے جو کسی دوسرے کے ہاتھوں کے سہارے گردش کرتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میکانکی آلہ کا مُدبر کون ہے؟ وہ کون سا ہاتھ ہے جو اسے حرکت دیتا ہے۔ آج تک جدید علم اس مدبر کی معرفت نہیں حاصل کر سکا۔ لیکن یہ بات جدید علم پر بھی ظاہر ہے کہ وہ مدبر جو بھی ہو مگر مادہ سے کسی طرح بھی مرکب نہیں ہو سکتا۔

آج تک ہماری ترقی کا خلاصہ یہ ہے کہ، خدا نے ہمارے وجود میں معرفت کی ایک چنگاری پیدا کر دی۔ بس انسان گویا اس وقت عالم خلقت کے بچپنے سے گزر رہا ہے اور اب وہ دماغ کا ادراک کرنے لگا ہے۔ اور مستقبل میں اس آسمانی نعمت کو حاصل کرے گا، تب وہ اپنی ذات

میں ابدیت و خلود کی معرفت حاصل کرے گا۔[1]

اگر تجلیات روح اور اس کے مظاہر جسم کے آثار و خواص سے ہوتے یا دماغ کے نشاۃ کی پیداوار ہوتے ۔ اور اعصابی آلات کا وظیفہ ہوتے تو پھر ہم بقائے شخصیت اور اس کے ثبات کی تفسیر و تحلیل کیونکر کرتے ؟ جو حقیقت مادی قوانین کے تابع نہ ہو اس کی ابدی بقا کا تصور بہت ہی طبیعی امر ہوا کرتا ہے ۔

اب رہی بعض مادہ پرست حضرات کی تفسیر ـــــــ جو انا کے نسبی ہونے کی بنیاد پر مبنی ہے اور جو اس بات پر مبنی ہے کہ ذات عین اس وقت میں جب وہ ثابت و برقرار ہوتی ہے محل تحول و تغییر بھی ہوا کرتی ہے ـــــــ تو صرف شاعری ہے علمی تفسیر سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے اور یہ وحدۃ الشخصیۃ الانسانیہ کی تفسیر سے بھی عاجز ہے جس وحدت کو انسان اپنی پوری عمر محسوس کرتا ہے ۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو غلط تفسیر غلط نظریہ کی پیداوار ہو گی وہ اس مطلب تک پہنچائے گی کہ انسان یہ تصور کرے : میں جو پہلے تھا وہ اب نہیں ہوں ۔ میں تو ایک ایسا فرد ہوں جو پہلے فرد کی جگہ ہوں لیکن میں اپنے تصور کے لحاظ سے احساس کرتا ہوں کہ میں وہی ہوں ـــــــ ۔

اس کے علاوہ یہ تصورات میرے فعل ہیں اور میں ان کا مبداء ہوں نہ یہ کہ انا ایسے پے در پے اور مختلف ہونے والے تصورات کا مجموعہ ہے جو ذہن میں پائے جاتے ہیں ۔

ہم اپنے وجود کے اندر دو حقیقتوں کا ادراک کرتے ہیں ۔ جسم کی ظاہری ترکیب جو تجرباتی علوم کی تختہ مشق بنتی ہے ، ۲ ۔ فکر ، ادراک ، عشق ، حب ، بغض ، ضمیر جیسی چیزیں

---

[1] : راز آفرینش انسان (سر خلق الانسان) ص ۱۸۰ ـــ ۱۸۱

جو نہ تو حسّی ہیں اور نہ جسم کا انعکاس ہیں یہ دوسری چیزیں ہیں جو باقی علوم کے دائرے سے باہر ہیں، ان کا قیاس مادی معیاروں پر نہیں کیا جا سکتا — یہ دوسرے واقعات ہیں جو جسم سے بلند تر ہیں اور جسم پر حاکم ہیں۔ پس انسان زیادہ موت ہو جاتا ہے مگر ذلیل زندگی بسر کرنے پر تیار نہیں ہوتا، وہ اپنے بدن کے لئے اجیر بیماری کو توڑ دیتا ہے اور بھوکا رہتا ہے مگر غذا نہیں کھاتا یا یہ طے کر لیتا ہے کہ موت تک اس قسم کی چیزوں کو برداشت کرتا رہوں گا۔

ہم ایک موضوع سے "جو حسّی و تجرباتی ہے" سروکار نہیں۔ ہم بھلا اس فولادی ارادہ کی جو ذہنی اُمیدوں اور عقل کی خاطر بدن کی قربانی پیش کر دیتا ہے کس مادی منطق سے کیونکر تحلیل کر سکتے ہیں؟

جو شخص اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ انسان صرف وظائف فسیولوجی مادیہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان امور کی منطقی و مادی توضیح بھی پیش کرے اور اگر انسان صرف اسی مادی جسم کا نام ہے تو وہ خود اپنے لئے کیونکر ایک ہی وقت میں آمر و مامور ہو سکتا ہے؟

اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ ایک اور حقیقت ہے جو بہت بلند اور بدن سے الگ ہے مگر بدن کی حاکم ہے۔ اور یہ سارے ارادی امور اور مختلف غرائز پر داخلی تسلط اور تمام نتائج ایک ایسے عنصر بلند و برتر کے وجود پر دلالت کرتے ہیں جو مادہ سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور وہی انسانی ارادہ کا منبع ہے اور وہی وجود کے ان دونوں قسموں کی طرف جاری ہدایت کرتا ہے اور وہ دونوں کچھ اس طرح کے ہیں کہ ایک دوسرے پر آمر و حاکم ہیں اور اس کی حقیقت مادی جسم سے کہیں بلند ہے۔

قرآن مجید اعلان کرتا ہے: وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔
(س الشمس آیت ۷، ۸) اور جان کی (قسم) اور جس نے اُسے درست کیا پھر اس کی بدکاری

اور پرہیزگاری کو اسے سمجھایا۔

قرآن کی نظر میں انسان ایک ایسے جوہر سے مزین ہے جو ادراک و تحرک سے ممیز ہے اور چونکہ وہ قابل الہام ہے اس لئے اسکو ادراک ہے اور چونکہ وہ ایسے اعمال مجبور کا مبداء ہے جو تقویٰ یا فساد کی بنیاد ہیں لہٰذا اس میں تحرک ہے۔

اب وہ کون سا جوہر ہے جو ان قوی و قدرت سے متصف ہے؟

بدن کے کسی عضو میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ ان خصوصیات کا حامل ہو لہٰذا قہری طور پر ماننا پڑے گا کہ بدن سے مقارن ایک جوہر ہے جو مستقل و اصیل ہے تاکہ تمام سابق اوصاف اس پر منطبق ہو سکیں (اور وہی روح ہے)

مادہ ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے اور مؤثرات کے مقابلے میں اس کی خبر دہی ممکن ہے اور وہ حالات متشابہ میں ایک ہی رہتا ہے، مثلاً سردی میں پانی جم جاتا ہے گرمی سے دھاتیں پگھل جاتی ہیں اور یہ ایسے ردِ عمل ہیں جو طبیعی ہونے کے ساتھ تغیر کے قابل نہیں ہیں۔

لیکن انسان میں مکمل طریقہ سے متفاوت ردِ عمل کے اظہار کی قدرت ہے بلکہ ایک مؤثر مقابل میں متناقض ردِ عمل کے اظہار کی طاقت ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ روح ادراک سے ظاہر ہونے والا ارادہ غیر مادی ہے اور خاص مادہ کے جو مجموعے سے خارج ہے۔

ادراک کا آپریشن کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نتیجتاً ادراک میں دو چیزیں ہیں، ایک تو وسیلۂ ادراک جیسے آنکھ، دوسرے قوتِ مدرکہ، اور ایک مسلم فزیائی قانون ہے کہ اگر کوئی شخص متحرک نظام کے داخل میں موجود ہے تو وہ خود حرکت کا ادراک نہیں کر سکتی اور اگر وہ حرکت کا ادراک کرنا چاہے تو خارج سے اس کی مراقبت کرنی ہوگی اور اسے نظام متحرک کے باہر توقف کرنا پڑے گا تاکہ اشیاء کا گزر اور زمانہ کی حرکت کا احساس کر سکے۔ مثلاً زمین پر رہنے والا زمین کی حرکت کا ادراک نہیں کر سکتا جس طرح قمر پر رہنے والا چاند کی حرکت کا ادراک نہیں کر سکتا۔

بلکہ وہ جب متحرک نظام کو دیکھنا چاہتا ہے اپنے کو اس سے خارج کرلے تب دیکھ سکے گا۔

اس بحث کی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ اگر زمان کی مستمر حرکت سے ہمارے قوائے مدرکہ خارج نہ ہوتے تو ہم زمان کی حرکت اور اس کے مرور کا ادراک نہ کر سکتے لہٰذا مرورِ زمان کا ادراک اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ہمارے قوائے مدرکہ زمان کے چنگل سے خارج ہیں۔

اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ہمارا ادراک لحظہ بہ لحظہ متغیر ہوتا رہتا ہے اور زمانے کی مستمر حرکت کے ساتھ حرکت کرتا رہتا ہے تو پھر ہم مرورِ زمان کے ادراک پر کسی طرح قادر نہ ہو سکیں گے کیونکہ ایسی صورت میں ہمارا ادراک جز جز کر کے آئے گا اور ہر جزء دوسرے جزء سے مستقل ہوتا ہے اور جب ہم زمانے کا ادراک کرتے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ ہمارے قوائے مدرکہ زمان سے خارج ہوں اور اس سے بلند ہوں کہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے پاس قوت مدرکہ کا وجود ہے اور یہ قوت مستقل ہے اور ثابت حقیقت ہے اور زمان سے فوق ہے۔

پس گویا حقیقت انسان کا نصف بوڑھا ہوتا ہے اور زمانے میں مستہلک ہو جاتا ہے اور دوسرا نصف ایسا ہے کہ زمانے کی موجیں اسے ہلاک نہیں کر سکتیں اور نہ وہ تحلیل ہو سکتا ہے نہ فنا ہو سکتا ہے بلکہ وہ خود زمانے پر غالب ہے اور اس کی مخصوص زندگی ہمیشہ باقی ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: لوگو ہم اور تم بقاء کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، فناء کے لئے نہیں۔ بس اتنا ہے کہ ہمیں اس گھر سے منتقل ہونا ہے۔ لہٰذا تم لوگ جس گھر کی طرف منتقل ہونے والے ہو اور جس میں ہمیشہ رہنے والے ہو اس کے زادِ راہ کا انتظام کرو۔[1]

---

[1] البحار، ج ۱۵، طبع قدیم القسم الثانی ص ۱۸۴

مادہ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ ظرف و مظروف میں ایک مخصوص نسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اس بناء پر بڑی چیز مکمل طریقے سے چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی مثلاً اگر بلند پہاڑیوں پر کھڑے ہوں اور ہم اپنے سامنے وسیع گھاٹیوں اور متعدد بڑے گہرے غار دیکھ رہے ہوں اور ان گھاٹیوں میں اور وادیوں میں چھوٹے اور بڑے بڑے درخت بکثرت ہوں مختلف قسم کے پرندے ہوں، بڑی بڑی ٹیلے اور پرچٹانیں ہوں اور یہ ساری چیزیں اپنی پوری تفاصیل کے ساتھ ہمارے ذہن میں محفوظ ہو جائیں تو کیا یہ تمام چیزیں اپنی خارجی وسعتوں کے ساتھ ہمارے چھوٹے سے دماغ میں اور اس کے کمزور خلیوں میں اپنی تمام خصوصیات کیساتھ حلول کر گئی ہیں! اور کیا یہ چھوٹا سا مادہ (دماغ) اپنے اندر ان تمام بڑی بڑی چیزوں کو ان میں کسی کمی کے بغیر سموئے ہوئے ہے!

ظاہر ہے کہ عقل و منطق دونوں کا جواب نفی میں ہوگا کیونکہ ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ بڑی چیز اپنی پوری کیفیت کے ساتھ چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی بلکہ ظرف کو اپنے مظروف سے بڑا ہونا چاہیئے یا کم از کم مساوی ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ہزار صفحوں کی کتاب کو ایک چھوٹے سے ورق میں (حروف کو چھوٹا کئے بغیر) تحریر کر دیا جائے۔

ہمارے لئے بہت آسان ہے کہ اپنے افکار میں ایک بڑے شہر کو اس کی تمام عمارتوں سڑکوں، باغوں، باشندوں سمیت مجسم کر لیں۔ لیکن "بڑی چیز چھوٹی چیز میں نہیں سما سکتی" والا قانون کہتا ہے کہ ذہنی صورتیں تو بہت بڑی ہیں یہ چھوٹے سے دماغ کے کمزور خلیوں میں سما ہی نہیں سکتیں، کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ انطباق اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جبتک مظروف چھوٹا نہ ہو یا کم از کم برابر نہ ہو۔ حالانکہ ہمارے قوائے مدرکہ کی کچھ خصوصیات و معین صفات ہیں جو مادہ کے خصائص پر منطبق ہی نہیں ہو سکتے، لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وہ صرف تعلقات نیز بالید کے مجموعے کے ساتھ کہ جو اس کے مادہ اور اس کے ساتھ کام کرتا ہو متعلق ہو سکے،

اس لیے ماننا پڑے گا کہ ہماری ذہنی صورتوں میں ایک اور قسم کا بھی وجود ہے ـــــ جو مقدمات فیزیائی اور کیمیاوئی کے مجموعے کے علاوہ ہے ـــــ اور اس وجود کے خواص جسم مادی کے آفاق سے کہیں بلند ہیں اور اس وجود کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بہت عظیم چیزوں کا استیعاب کر سکتا ہے اور ادراک شدہ صورتوں کو ضائع کیے بغیر اپنے اعماق میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔

مادی حضرات کہتے ہیں: جس طرح ایک کبیر الحجم کتاب کو میکرو فلم کے ذریعے ایک چھوٹے سے ورق میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان تمام صورتوں کو دماغ میں بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے اور ضرورت کے وقت ایک چھوٹے سے مقیاس سے ان چیزوں کو پھر دوبارہ بھی دیکھا جا سکتا ہے اور اگر کوئی مقیاس واقعی کی معرفت چاہتا ہے تو اسے اسی حساب سے بڑا کرنا پڑے گا اسی طرح یہ بڑی چیزیں چھوٹی ہو کر دماغ میں محفوظ ہو جاتی ہیں ـــــ

لیکن یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دماغ اور اعصاب میں کس جگہ پر ان بڑی صورتوں کی جگہ ہے؟ اب یا تو ہم اس قسم کی بڑی صورتوں کے ذہن میں موجود ہونے سے انکار کر دیں اور یا پھر اس کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں لیکن کوئی شخص صور کبیرہ کے ذہن میں موجود ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اب اگر روح مادی شئے ہوتی اور ادراک دماغ اور عصبی مجموعہ کے نشاط کا نام ہوتا تو صور کبیرہ کا چھوٹے چھوٹے خلیوں میں انطباق ممکن نہ ہوتا کیونکہ وہ صورتیں اپنے برابر کی جگہ چاہتی ہیں۔ اور رہا میکرو فلم تو خارج میں سوائے خطوط اور بہت چھوٹی چھوٹی خلیوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس لیے ہم اس اعتراف کے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اس میں کوئی ایسا عنصر ضرور دخیل ہے جو دکھائی نہیں دیتا۔ اور وہ ہے "روح" ہے۔ روح ایک مجرد حقیقت ہے جس میں دماغی اور عصبی نشاطات کے مجموعہ ـــــ جو صرف مقدمات و معدات ہوتے ہیں ـــــ

کے بعد صورِ کبیرہ کے تخلیق کی صلاحیت ہوتی ہے۔ پھر اس وضع میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اس مفروضہ کے مان لینے کے بعد اشکال ختم ہو جاتا ہے اور ناقص و ناپختہ تفسیروں سے ہمیں چھٹکارا مل جاتا ہے۔

ایک اور بات: ظواہر ذہنیہ اور ظواہر مادیہ کے درمیان تمیز و فصل کا ہونا ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں گروہ خواص و کیفیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں کیونکہ مادہ ہمیشہ خواص عامہ کے مجموعہ سے مقرون ہوا کرتا ہے جیسے متفاوت صورتوں کا قبول کرنا لیکن ظواہر ذہنیہ میں یہ خواص نہیں پائے جاتے اور یہی عدم مشابہت ہمیں روح کے مجرد اور مستقل ہونے پر مجبور کرتی ہے۔

مادی موجودات کے دوسرے خواص و آثار یہ ہیں کہ مادی موجودات ہمیشہ تدریجی، زمان، مکان کے محتاج ہوتے ہیں۔ بلکہ جو شئی بھی تحول اور تدریجی تبدل کو قبول کرے گی وہ مکان کی محتاج ہوگی۔ آخر میں وہ موجوداتِ مادیہ کا حتمی انجام موت ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح ہر مادی موجود یا ظاہرہ مادیہ کی دوسرے اجزاء کی طرف تقسیم ممکن ہوا کرتی ہے چاہے وہ تقسیم مخصوص آلات و وسائل کے ذریعے ہو یا عقل و خیال میں ہو۔ اگر بہت چھوٹی چیز ہے تو عقلی تقسیم ممکن ہے، لیکن ظواہر روحیہ میں یہ تمام صفات نہیں ہوتے۔

مثلاً ہم اپنے ذہن میں ایک عظیم عمارت کا تصور کر سکتے ہیں، بغیر اس کے کہ زمان کے محتاج ہوں۔ اور اس صورت میں مخزن ذہن کے اندر بہت سے اشکال، الوان، اقسام، اسماء، اعداد، ارقام، کلمات، عناوین جمع ہو جاتے ہیں لیکن نہ تو ایک دوسرے سے مخلوط ہوتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کو محو کرتا ہے۔ (لیکن مادی شئے میں یہ ناممکن ہے)۔

ذہن مختلف مناظر اور صورتوں کا ادراک کرتا ہے، تمام چھوٹے بڑے حادثات کا ادراک کرتا ہے اور پھر انہیں محفوظ کر لیتا ہے۔ بلکہ مدعی ہے کہ اگر ہمیں کبھی یہ تصور ہو جائے کہ ہم کوئی

چیز بھول گئے ہیں تو وہ شئی مسلوہ ذہن سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس میں کہیں نہ کہیں محفوظ رہتی ہے اور کسی وقت یا کسی خاص وجہ سے فوراً ذہن میں آ جاتی ہے۔

دماغ کے کسی گوشہ میں یا کسی جگہ تمام اعداد و ارقام و صورتیں بغیر خلط ملط ہوئے موجود رہتی ہیں۔ اور کسی خاص واقعہ کے تحت فوراً (بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ذہن میں کود کر آ جاتی ہیں — تو یہ ذہنی صورتیں جو ایک حیرتناک راز ہیں آخر کس جگہ رہتی ہیں؟ اور کیا مادی حضرات کی تفسیر صحیح واقعی تفسیر ہے؟ اور کیا اس سے حقیقت روح کی توضیح ہو سکتی ہے؟ اور کیا ممکن ہے کہ دماغ کے خلیوں پر مرتسم خطوط اور خواطر مادی اعراض سے ہوں؟ اور کیا دماغ کے خلیے اور دماغ کے تہہ در تہہ حصوں میں اتنی استطاعت ہے کہ حادثات و واقعات کو محفوظ کر لیں اور بند کر کے وقت ضرورت سے جمع کئے ہوئے ذخیرے کو ذہن کی طرف لٹا دیں؟ نیز کیا یہ تفسیر حقیقت سے متعارض نہیں ہے؟ اگر حقیقتاً خواطر کا مرکز دماغ ہی ہوتا تو جس وقت دماغ کے خلیے بدل جاتے تو ان سے مرتبط یادداشت کو بھی بدل جانا چاہیئے تھا۔ یاد رکھئے دماغ کے خلیے تمام عمر میں متعدد مرتبہ بدل جایا کرتے ہیں لیکن ہمارے دوستوں اور احباب کی صورتیں بچپنے سے آخر عمر تک محفوظ و سالم رہتی ہیں ان میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔

جب ہمارا دماغ اپنے تمام مشتملات ——— اور من جملہ مشتملات ہمارے سابقہ معلومات بھی ہیں ——— کے ساتھ متغیر ہو جاتا ہے اور دماغ کے سابق خلیوں کی جگہ نئے خلیے آ جاتے ہیں تو پھر عالم ماضی کی طرف التفات ناممکن ہو جاتا اور ہمارے تمام بعد والے ادراکات سابق ادراکات کے مشابہ ہو جاتے (عین نہیں ہو سکتے) حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ گزرے ہوئے واقعات کی طرف التفات خاطر کی تجدید کے لئے ہوتا ہے اس سے کوئی نیا علم نہیں حاصل ہوتا۔ بلکہ اگر ہمارے ذہنی مفاہیم مادی ہوتے تو ساری سابق معلومات کی یادداشت ناممکن طور سے واپس آ جاتی۔

مشہور محقق ہنری برگسون

HENRI BREGSON

کہتا ہے : لیکن ہمیں صرف اتنا یاد ہے کہ حواس و شعور کے ذریعے حوادث ——
خواہ وہ صحیح ہوں یا مریض —— کا ملاحظہ کرنا فزیالوجی کی ان تمام تغیروں کو نقش بناتا ہے
جو حافظہ کے سلسلے میں کی گئی ہیں اور (یہی بتاتا ہے کہ) یادداشتوں کی حفاظت کی نسبت دماغ
کی طرف دینا محال ہے۔ ہم صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ تضییق کے وقت سے حافظہ کے لئے
جو یکے بعد دیگرے انبساطات ہوتے ہیں ان کی متابعت کریں۔ اور یہ حافظہ جس وقت
اس ماضی سے ہاتھ جھاڑ کر بیٹھ جاتے جو پورے کا پورا منفذ نہیں ہوتا تو آخری مرتبہ تک اس
سے صرف ان چیزوں کا ظہور ہوتا ہے جو عمل حاضر کے لئے بہت ہی ضروری ہوں۔ اور ہم نے
بطور تشبیہ یہ کہا تھا کہ اس کے ذریعے ہم مخروط کی چوٹی سے اس کے قاعدہ تک پہنچ سکتے ہیں
(اور وہ قاعدہ یہ ہے۔) مخروط صرف اپنی چوٹی پر مادہ سے متصل ہو سکتا ہے، لیکن جب
تک ہم جدید میدان میں داخل نہ ہوں اس کی چوٹی سے نہیں گزر سکتے۔ اب وہ جدید میدان کیا
ہے ؟ اس کا نام روح ہے ؟ یا اگر تم چاہو تو اس کا نام نفس رکھ سکتے ہو ! اس شرط کے
ساتھ لغوی استقلال کی اصلاح کر لیں اور اسے اتفاقی تعریف دے دیں تب ہم اس کل کے تحت
تجربات کے ایک مجموعہ کو درج کر سکتے ہیں !

اور اس تجرباتی بحث کے بعد بقائے نفس کے امکان یا احتمال تک پہنچ سکتے ہیں : کیونکہ ہم
نے خود اس دنیاوی زندگی میں نفس کو بدن سے الگ مستقل طور سے ملاحظہ کر لیا ہے۔ بلکہ گویا
اس بات کو اپنے ہاتھوں سے اس وقت سے بھی چھو لیا ہے، اور خود خلود بھی استقلال کی ایک
قسم ہے ——

البتہ موت کے بعد ظروف بقاء کی معرفت "خصوصاً اس کی مدت کے بارے میں بحث
ہی ناقص ہے کہ آیا یہ بقاء ایک مدت تک ہے یا ابدی بقاء ہے؟

اس کے علاوہ کم از کم ہم ایک ایسے نقطہ تک تو پہنچ گئے کہ جس کا تجربہ ممکن ہے اور تجربہ
کے بعد ممکن ہے کہ حقیقت کی ایک ایسی تقریر کی جا سکے جس کی روشنی ہو سکے اور یہ بھی ممکن ہو جائے
کہ ترقی کی طرف ہماری معرفت اور آگے بڑھ جائے اس کو ہم "عالم ادنیٰ" کا تجربہ کہتے ہیں۔
اور جب ہم "عالم اعلیٰ" کی طرف منتقل ہو جائیں گے تو ایک دوسری نوع کا تجربہ ہوگا جسے ہم
"حدس صوفی" کہتے ہیں۔ اور یہ حدس صوفی جوہر الٰہی میں مشترک ہوتا ہے۔ اب کیا یہ دونوں تجربے
کہیں پر مل جائیں گے؟ زندگی کے بعد والی بقاء ـــــ جو تمام نفوس کے لئے ہے ـــ
محض اس وجہ سے کہ اس کے نشاۃ کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ جسد سے الگ و مستقل ہے، کیا
اس بقاء کی مانند ہوگی جو "عالم ادنیٰ" میں ممتاز نفوس کو حاصل ہوتی ہے یا ایسی نہیں ہوگی؟
جہیں اس سلسلے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ہمارے بس میں صرف دو باتیں ہیں ۱- ان دونوں
تجربات کی مدت کو طویل کرنا ۲- ان دونوں تجربات کے بارے میں گہرائی سے سوچنا۔

امتزاز اور عطب "جو کبھی دماغ کو پہنچتا ہے اور کبھی حوادث کے بھول جانے کی صورت
میں ہوتا ہے" کے درمیان تداول کو نہیں دیکھا جاتا، حالانکہ جو بھی نقش خاطرہ منفیہ کے اندر
ہوتا ہے وہ ان خلیوں کے نقش کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس خاطرہ سے متعلق ہوتے ہیں۔
اگر دماغ کے بعض خلیوں میں عطب "ہلاکت یا شکستگی" کا حملہ ہو جائے تو انسان کی
گفتگو میں خلل پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے خاطرات اپنی جگہ پر محفوظ رہتے ہیں، ان
میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا۔ اور اگر دماغ میں التہاب شدید پیدا ہو جائے یا اس کے بعض

۱؎ : ضبط الاخلاق والدین ص ۲۸۱، ۲۸۲

اطراف وجوانب شکست کے شکار ہو جائیں اور شدید دماغی اختلال پیدا ہو جائے تو خواطر اور دماغ کے اندر جو مساوات ہے وہ بھی مضطرب اور خلل کا شکار ہو جاتا ہے۔

کیونکہ نسیان ہمیشہ معین و خاص نظام کے تحت ہوتا ہے اور نسیان کے اس منظم تسلسل کی وجہ سے مریض اپنے دوستوں اور پاس بیٹھنے والوں کے نام تک بھول جاتا ہے اور پھر ان کلمات تک کو بھول جاتا ہے جو افعال سے متعلق ہیں۔

پس یہاں پر دو مطلب ـــــ ہلاکت یا شکستگی ـــــ جو نظام و کیفیت و مراحل زمانی کی طرف سے دماغ پر اور نسیانِ خواطر پر ہوا ہے۔ اس کے درمیان کسی علاقہ کو نہیں دیکھا جاتا۔ حالانکہ مادی حضرات کی منطق کا اساس ہی یہ ہے کہ جو ضرر خواطر کو پہنچا ہے اور جو مادی ضرر دماغ کو پہنچا ہے ان دونوں میں براہ راست کسی علاقہ کا ہونا ضروری ہے یا کم از کم دونوں میں ایک مخصوص تناسب بہر حال ضروری ہے۔

یہ تمام واقعات ہم پر یہ بات واضح کرتے ہیں کہ دماغ صرف ضبط خواطر کا وسیلہ ہے عملیہ تذکر میں دماغ کا دخل صرف اس قدر ہے جس قدر ذہنی صورتوں کو کلمات تک نقل کرنے کا ہوتا ہے یعنی وہ صرف وسیلہ و واسطہ ہوتا ہے۔

اس کی ساری مہم جوئی جو عالم روح اور عالم مادہ کے درمیان اتصال پیدا کرتا ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ ہم مجال خواطر اور ذہنی صورتوں میں ایک ایسے ظاہرہ کے محتاج ہیں جو دماغی خلیہ سے ارفع ہوتا ہے اور وہی ظاہرہ روح مجردہ ہے جو مادہ سے مستقل ہے اور تمام افکار، صور و خواطر اس کے مخصوص قوانین کے تابع ہیں۔

پروفیسر گاٹون : GUYTON

ـــــــــ اپنی کتاب "الفیزیولوجیا" ـــــ جامس میلنگ

معتبر ترین کتاب ہے ـــــــ میں لکھتے ہیں : وہ ہی دانشور حافظہ وتعلم کے دراسۃ میں سب سے مشکل چیز یہ ہے کہ ہم کسی بھی فکر کی عصبی ترکیب کو نہیں پہچانتے !

ادراکات و تصدیقات بھی انقسام کے قابل نہیں ہیں اور نہ دماغ کے خلیئے ان کی جگہ ہے اور یہ مستقل طور سے یا کسی دوسرے کی احتیاج میں تقسیم کو قبول نہیں کرتا ، بلکہ یہ تمام ادراکات و تصدیقات ایک غیر مادی موجود سے مرتبط ہیں۔

مثلاً جب کہتے ہیں : اس چڑیا کا رنگ اخضر ہے ، تو ظاہر ہے کہ اس جملہ میں چڑیا تقسیم کے قابل ہے ۔ رنگ اخضر قابل تقسیم ہے البتہ رنگ کی تقسیم باعتبار محل ہوگی لیکن چڑیا کے رنگ کی تصدیق کا یہ مفہوم کسی بھی قسم کی تقسیم قبول نہیں کرتا۔

اگر ہم تفکیر کو مادہ کا نتیجہ مان لیں تو پھر یہ مفہوم " چڑیا کے رنگ کی تصدیق " بھی قابل تقسیم ہوتا ـــــــ حالانکہ تصدیق افعال روح میں سے ایک فعل ہے ـــــــ اور تصدیق میں تقسیم کی صفت نہیں پائی جاتی ۔ لہٰذا جب روح کا ایک فعل ـــــــ تفکیر ـــــــ مادی اثر سے خالی ہے ـــــــ یعنی تقسیم سے خالی ہے ـــــــ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تفکیر کو تجرد سے متصف کریں تو پھر صاحب تفکیر یعنی روح کے اندر بھی تجرد کا خاصہ ہوگا ۔ پس گویا ہم تجرد تفکیر سے تجرد روح تک پہنچے ہیں ۔

اب سابق ادلہ کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ ماورائے طبیعت کے انکار کے سلسلہ میں مادی حضرات نے جو بھی دلیلیں پیش کی ہیں انہیں مضبوط و محکم دلیلوں سے توڑا جا سکتا ہے اس کے علاوہ وہ دلیلیں غیر ثابت فرضی چیزوں پر مبنی ہیں جیسے کہ ظواہر حیویہ از قسم تفکر و فکر اور ادراک کو ظواہر مادیہ کہتے ہیں ۔

اس قسم کے نظریات اسرار کے چہرے سے نقاب نہیں ہٹا سکتے اور واقعات کی گرہ نہیں کھول سکتے کیونکہ تجرباتی علوم نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس قسم کے ظواہر کے طریقۂ عمل

اور ماہیت کی معرفت پر قادر نہیں ہیں۔

جب مادی حضرات کا فلسفی نظام ان امور کا جواب نہیں دے سکتا تو وہ مستقبل میں ان سکوں کے مانند ہو جائے گا جو رائج الوقت نہیں ہیں۔ بہرحال جب فلسفہ میں پختگی آجائے گی اور افکار میں ترقی ہوگی اور ذہن میں اضافہ ہوگا اور انسان اس افق کی تنگی سے نکل جائے گا جس نے اسے ایک بُعد والا موجود قرار دے رکھا ہے تو مادی حضرات کا فلسفہ محملات کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے گا۔ جس طرح گذشتگان کے کمزور عقائد طاق نسیان کے نذر ہو گئے۔

تجربے بھی راستے روشن کرتے ہیں

واقعات کے درمیان روح جو مجرد ہے اگر اسے ہم تجربات کی روشنی میں ثابت کریں اور تجربہ ہی کی راہ سے اس کے استقلال کو ثابت کریں تو لوگوں میں اس کا گہرا اثر ہوگا، کیونکہ حسی معرفت لوگوں پر حاوی آجاتی ہے۔ خصوصاً یہ طریقہ ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہے جو پیچیدہ اور دقیق مسائل کا ادراک نہیں کر سکتے اور ان لوگوں کے لئے بھی بہت مفید ہے جو تجربات کو علمی اور فلسفی مسائل پر مقدم سمجھتے ہیں۔

روح کے مستقل اور موت کے بعد باقی رہنے کی زندہ دلیل روحوں سے ارتباط پیدا کرنا ہے اور یہ رابطہ انیسویں صدی میں بہت عام ہے اور آج کل تو اسے علمی بنا دیا گیا ہے، عالمی شخصیتوں نے مختلف اجتماع میں اس کا مشاہدہ کر لیا ہے۔

بہت سے علماء نے اندھے تعصب اور سطحی احکام سے بلند ہو کر بڑے شوق سے روح کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ بڑی دقت اور تجربہ کے بعد انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنے اس نتیجہ کا اعلان کیا کہ یہ موضوع نظر باقی نہیں ہے بلکہ روح کا واقعی

وجہ ہے۔

اور عمیق و دقیق تجربے تو یہ بھی بتاتے ہیں کہ انسان گذشتگان کی روح سے بھی رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اور اس منزل میں انسان مردہ روحوں سے بات چیت بھی کر سکتا ہے اور جو بات نہیں معلوم ہے اسے بھی حل کر سکتا ہے۔ اور بہت سے ایسے پیچیدہ مسائل پائے گئے جن کا حل ان مردہ روحوں نے کیا جو زندگی میں ایسے مسائل کے اہل ہی نہ تھے۔

روحیں اس بات پر بھی قادر ہوتی ہیں کہ زمین سے بغیر کسی مادی عامل اور جسمانی قوت کے بڑے بڑے جسم اٹھا دیتی ہیں۔ وہ اشخاص جو روحوں سے ارتباط کے سلسلہ میں بالکل بیہوشی کی صورت میں پڑھتے ہیں انہوں نے مستقبل کے بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس مخصوص حالت میں ایسی زبان میں باتیں کرتے ہیں جسے وہ جانتے بھی نہیں اور نہ ہی کچھ پاتے ہیں۔

اس ارتباط کے سلسلہ میں یہ عجیب بات بھی ہوتی ہے کہ وہ شخص مخفی رازوں سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور حیرت ناک بات یہ ہے کہ جو لوگ تسخیر ارواح میں واسطہ ہوتے ہیں وہ ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی بیہوشی کی حالت میں خطوط لکھ دیتے ہیں اور صندوقوں میں سربند کاغذات کی عبارت پڑھ دیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ایسے کام کر دیتے ہیں جن کا تسلی بخش جواب اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا جب تک ہم ایک غیر مرئی عامل ——— روح ——— کے قائل نہ ہو جائیں۔

اور یہ مسائل مجرب ہیں ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ مادی حضرات کا نظریہ غلط ہے۔ کیونکہ اگر روح صرف مادہ کے طبعی آثار سے ہوتی اور صرف دماغ کے خلیات کے خواص کا نتیجہ ہوتی تو اس قسم کے متنوع تجربات کی تفسیر ناممکن ہو جاتی۔

اور اس بندراستہ سے چھٹکارا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم مادہ سے مافوق ایک قوت کا اعتراف نہ کر لیں جو اس حرکت کی خالق ہے اور اس سلسلہ میں ہونے والے

تمام واقعات کو مادی عامل کا اثر بھی نہیں مانا جا سکتا۔

یہ بات درست ہے کہ عاملوں کے نزدیک سن کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن تحضیر ارواح کے سلسلہ میں عامل حضرات عموماً بچوں کو واسطہ بناتے ہیں۔ اور ان کے واسطہ سے روحوں سے باتیں کرتے ہیں تاکہ دھوکہ بازی اور چارسو بیسی کا امکان نہ رہے۔

اس کے علاوہ اس فن کے ماہر و محقق حضرات تحضیر ارواح کے جلسوں میں خود بھی شرکت کرتے ہیں اور اپنے دقیق تجربوں کا اعادہ کرتے ہیں تاکہ ہر قسم کا ابہام دور ہو جائے اور کسی قسم کی تردید نہ رہے اور "اتفاق" کہانے پڑ جانے کا احتمال ختم ہو جائے۔

حالانکہ یہ موضوع ایک واقعی بنیاد پر قائم ہے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ دنیا کے دیگر حقائق کی طرح بعض دھوکہ بازوں اور جعلسازوں نے اس فن کو بھی داغدار بنا دیا اور بدنام کر دیا اور سڑکوں، گلیوں میں یہ تماشا دکھانے لگے اس لیے "تحضیر ارواح" کے تمام مدعی حضرات کی باتوں پر اعتماد نہ کر لینا چاہئے اور نہ یکایک ہی اس حقیقت کا انکار کر دینا چاہیئے کیونکہ یہ بات منطق کے خلاف ہے۔ اس لئے بہت ہی عمیق فکر کے بعد ہی اس حقیقت کا اندازہ اور ادراک کیا جا سکتا ہے اور اسی کے سہارے جھوٹ سچ کی معرفت بھی حاصل ہو سکتی ہے۔

بیسویں صدی کے انسائیکلوپیڈیا کے مصنف جناب "فرید وجدی" نے یورپ و امریکہ کے علماء کی ایک فہرست لکھی ہے اور ان میں ہزاروں ایسے محقق و متخصص علماء کو منتخب کیا ہے جو اس فن "تحضیر ارواح" کے ماہر گزرے ہیں۔ اور ان علماء کی تصدیق و عینی مشاہدہ کو ذکر کیا ہے جس سے اس فن کی تائید ہوتی ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ناقابل انکار ہے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے اکثر وہ حضرات ہیں جو اس فن کے منکر تھے اور اسے خرافات کہتے تھے

اور اس فن کے جاننے والوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور وہ اس فن میں اس لئے داخل ہوتے تھے کہ اس کے بطلان کو ثابت کیا جا سکے۔ اور اگر اس وقت کوئی شخص اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ میں "تحضیر ارواح" کو علمی طریقہ سے ثابت کرنے پر قادر ہوں۔ تو یہ لوگ اس کا خوب خوب مذاق اڑایا کرتے تھے۔

لیکن اس کے انکار کے باوجود جب تجربات سے مطمئن ہو گئے تو "تحضیر ارواح" کے موضوع کے علمبرداروں میں ہو گئے اور بالآخر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔

البتہ سابق علماء نے اپنے کو اس بحث میں ڈالا ہی نہیں تاکہ یہ معلوم کر سکتے کہ "تحضیر ارواح" کے معتقد حضرات صحیح کہہ رہے ہیں یا غلط! اور شاید وہ حضرات اس کو بالکل ہی بے فائدہ تصور کرتے تھے لہٰذا اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا۔

فرید وجدی نے یہ بات بھی لکھی کہ اس فن کے ماہرین نے بہرحال اس نظریہ کو مان لیا جو یہ کہتا تھا کہ: جسم کے مرنے کے بعد روح نہیں فنا ہوتی اور اپنے غیر عادی طور میں محیر العقول واقعات کے مشاہدات کے بعد یہ تسلیم کر لیا کہ یہ سب ارواح کا کرشمہ ہے۔ اس لئے کہ ان محیر العقول واقعات کا وجود علمی طریقے سے ممکن نہیں ہے یہ تو صرف روحوں کی سعی و کوشش کا نتیجہ ہے ـــــ لیکن جو لوگ مقام استدلال میں پختہ کاری حاصل نہ کر سکے انہوں نے ان واقعات کو لاشعور و لاوعی کے حوالے کر دیا۔

اب کیا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یہ تمام علماء اور ماہرین بلا کسی قید و شرط کے جھوٹوں کے دام فریب میں آ گئے؟ اور اس حد تک کہ اپنے غیر واقعی تجربات کو آنکھ بند کر کے "علمی" بتانے لگے۔؟ اور کیا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ یہ حضرات بغیر کسی احتیاط کے ان چیزوں کی تائید کرنے لگے! یا یہ کہا جائے کہ واسطوں کی تلقین سے متاثر ہو کر بغیر سوچے سمجھے یہ حضرات اس بات کے قائل ہو گئے!

www.kitabmart.in

لہٰذا ان تمام متخصصین اور ماہرین کو غلط بتا دینا نامعقول سی بات ہے اس لئے افضل طریقہ یہ ہے کہ منطقی اسلوب سے اس موضوع کی تحقیق کی جائے۔

"قانونِ انتخاب طبعی" کے انکشاف میں ڈاروِن کے شریکِ کار:

آلفرد روسل والاس

ALFRED ROUSSEL VALLASE

نے تحضیر ارواح کے مختلف مطالعات کے بعد اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا ہے:

جب میں نے "تحضیر ارواح" کی تحقیق شروع کی تو میں ایک خالص مادی اور روحوں کا منکر شخص تھا اور مطلق کبھی بھی میرے ذہن میں مجردات اور عالم ماوراء الطبیعہ کا تصور بھی نہیں تھا اور ابتداء میں میرا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طرح علمی طریقہ سے میں اس فن کو غلط ثابت کروں، لیکن میں ایسے واقعات و تجربات سے دوچار ہوا کہ تھوڑا تھوڑا اس کی صحت پر ایمان لانے لگا اور ظہور روح کے مسئلہ نے مجھے متاثر کیا اور میرے اعماق میں یہ بات کچھ اس طرح محکم عقیدہ کی طرح جم گئی کہ میں نے اس کے ادراک و فہم سے پہلے اور اپنے ضمیر میں کسی توضیح کے آئے بغیر ہی اس پر پختہ عقیدہ رکھ لیا، اور اب میں اس عقیدہ سے منہ نہیں موڑ سکتا اور نہ میرے پاس اس کی کوئی علت یا مادی سبب ہے۔ (۱)

انگلستان میں مجمع علمی ملکی کے صدر جناب استاد کروکس

KROOKES

اپنی کتاب "انظواہر الروحیہ" میں تحریر فرماتے

---

(۱) عالم پس از مرگ (العالم بعد الموت) ص ۵۰

ہیں ؛ چونکہ میں ان ظواہر پر عقیدہ رکھتا ہوں اس لئے میں ادبی بزدلی کہتا ہوں کہ ان مذاق اڑانے والوں کے خوف سے جو اس سلسلہ میں کچھ نہیں جانتے اور نہ اپنے اوہام و خیالات کے گھروندے سے باہر نکلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ روح کے سلسلہ میں اپنی تمام معلومات کو چھپا لوں۔ اس لئے میں اپنی اس کتاب میں بڑی صراحت کے ساتھ ان چیزوں کو ذکر کروں گا جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور جن کی صحت کا بارہا تجربہ کر چکا ہوں۔

آؤ تسخیر ارواح کے ان جلسوں میں جن کا ادارہ علماء و محققین کرتے تھے جو تجربے اور معلومات حاصل ہوئے ہیں ان سب کے مجموعے سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ: انسان کے پاس ایک ایسی قوت ہے اور مستقل شخصیت ہے جو انسان کے مرنے سے فنا نہیں ہوتی اور وہ قوت ذاتی جسم کے بغیر مستقلاً اپنے تحرک و نشاط پر قادر ہے اور اس دنیا کے باشندوں کے لئے سلسلے بہت سے امکانیات کا مہیا کرنا ضروری ہے تاکہ مخصوص حالات میں وہ گزشتگان کی ارواح سے رابطہ قائم رکھ سکیں۔

تحقیقات نے ایک قدم اور بڑھایا ہے جس نے روح کے استقلال و بقاء کو بہت تقویت پہنچائی ہے اور وہ ہپناٹزم ہے ایک جگہ پر مخصوص التفات سے یا ایک روشن نقطہ پر مسلسل نظر جمانے سے یہ طاقت پیدا ہوتی ہے بشرطیکہ مسلسل ہدایات بھی دی جاتی رہیں تو اس سے انسان میں ایک مصنوعی نیند پیدا ہو جاتی ہے جو فطری نیند سے بہت زیادہ مختلف ہوتی ہے۔

اور جب انسان مصنوعی نیند میں سو جائے تو اس کے اس پاس جتنی بھی آوازیں ہوں ان میں سے صرف وہ سلانے والے کی آواز سنتا ہے اور بڑی شدت کے ساتھ اس کے افکار سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔

انگریزی عالم جیمس بریڈ JAMES BREED نے دوسرے دن

کی تحقیقات پر مسلسل کام کر کے ہپناٹزم کے میدان میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور پھر اپنی تحقیقات کو علمی قالب میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس میں اپنے مخصوص اصول کے کام سے کر اس کی علت کی وضاحت کی چنانچہ اس کی کوششوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا اس کے بعد یورپ اور امریکہ میں دوسرے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے اس علم کے توسع میں بڑی کوششیں کیں۔ جیسے ریشہ ——— امیل کوئہ ———
——— شارکو ——— ژولز ———
——— وغیرہ اور اسی شارکو ———

نے ہپناٹزم کے مراحل و درجات کو ابواب کی صورت میں تحریر کیا۔

ہپناٹزم کے اندر سلا دینے والا سونے والے کو اپنے ارادوں کا اتنا تابع بنا لیتا ہے کہ سونے والا بغیر کسی تردید کے اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے۔ اور اس مصنوعی نیند میں سونے والے کے حواس معطل ہو جاتے ہیں نہ تو سماعت کی قوت نہ بصارت کی نہ چھونے کی طاقت اور نہ ہی حس ذائقہ کچھ کام کرتی ہے اور سونے والا اپنے اعضاء میں ایک مخصوص قسم کا ڈھیلا پن محسوس کرتا ہے بایں معنی کہ اس کو چاہے کتنا بھی فشار دیا جائے نہ وہ کسی ثقل کا احساس کرتا ہے اور نہ کسی تکلیف کا۔[1]

ڈاکٹر فلیپ کارت PHILIP CARRET

جو ہپناٹزم کے ایک ماہر استاد ہیں اور انگلستان میں نشہ آور چیزوں کے متخصص ہیں، انگریزی رسالہ "الوقایۃ العامہ" میں تحریر کرتے ہیں، بہت ایسے مریض تھے جن کا آپریشن ضروری تھا

---

[1] اصول روانکاری فرائڈ (اسس التحلیل النفسی لفروید)

انکو ہپناٹزم کے ذریعہ بیہوش کرکے ان کا آپریشن کردیا گیا اور یہاں پر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہپناٹزم کے ذریعے بیہوش کرکے آپریشن کرنا بہت اچھا ہوتا ہے اور مخصوص دواؤں کے ذریعے مریض کو بے ہوش کرنے سے کہیں زیادہ آسان اور کم خطرہ ہپناٹزم کے ذریعے بے ہوش کرنے میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہپناٹزم کے ذریعہ آدمی کی حفاظت کے امکانات کئی گھنٹوں تک ہوتے ہیں اور اس کے ذریعے یہ بھی ممکن ہے کہ مریض جس عذاب و تکلیف میں آپریشن کے وقت مبتلا ہوتا ہے اس سے اس عذاب و تکلیف کو بھی ختم کردیا جائے۔[۲]

ایک اور عامل استقلالِ روح کو تلاش کیا گیا ہے جسے "مانیٹزم" کہتے ہیں۔ یہ قوت ہر انسان میں مختلف درجوں میں موجود ہے یہ بھی ہپناٹزم کی ایک قسم ہے مگر فرق یہ ہے کہ انسان اگر اس قوت کے بڑھانے کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس میں کمال حاصل کرلے تو صرف انسان ہی نہیں وہ حیوانات کو بھی اپنے زیر اثر کرلیتا ہے اور اس کو فطری شکل سے بھی مستقل بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہپناٹزم سے استفادہ صرف مخصوص عوامل کے ماتحت ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ "مانیٹزم" والی قوت انسان کے اندر اس طرح کی ہے کہ دشمن کی حرکت کو پرندوں کی پرواز تک کو اس سے روکا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات آج کے معاشرہ کی نہیں بلکہ ماضی میں بھی لوگ کسی حد تک اس قوت سے واقف تھے۔ البتہ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس مسئلہ کو علمی انکشاف کے نام سے پیش کیا گیا ــــ ہر روز ہپناٹزم کے ذریعے مریضوں کا علاج کرلیتے ہیں اور مسلسل تحقیقات کے نتیجے میں علماء نے یہ بات بھی ثابت کردی ہے کہ مانیٹزم سے ہپناٹزم کی طرف بھی منتقل ہوا جاسکتا ہے

---

[۲]: صحیفۂ اطلاعات ۳ $\frac{۶}{۱۳۴۴}$ ھ ش

اور اسی اثناء میں عجیب چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔

نفسیاتی ماہرین بہت سی نفسیاتی گتھیوں کو سمجھنے کے لئے ہپناٹزم کا استعمال کرتے ہیں اور مریض کے ذہن کی گہرائیوں کا کھوج لگاتے ہیں۔ اور مریض کے ایسے افکار و خیالات پر اطلاع حاصل کر لیتے ہیں جسے عام طور سے مریض ہوشیاری کی حالت میں شخصی مصالح یا انکشاف پر رسوائی کے خوف سے کبھی نہیں بتاتا۔ مختصر یہ کہ یہ لوگ مصنوعی نیند کی حالت میں مریض کو بہت سی باتوں کے اقرار اور رازوں کے انکشاف پر آمادہ کر لیتے ہیں جنہیں بیداری کی حالت میں مریض کسی بھی طرح ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔ مریض گہری نیند میں مقناطیسی قوت کے اتنا زیر اثر ہوتا ہے کہ سلانے والا جو بھی کہے سونے والا بے چون و چرا اس کی تعمیل کرتا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ شدید حالات میں سونے والے کا بدن بے حس ہو جاتا ہے اور اس کا کوئی عضو حرکت تک نہیں کرتا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جسم میں حرکت ہی نہیں ہے اور واسطہ اپنے آس پاس کی نہ کوئی چیز دیکھتا ہے اور نہ کوئی آواز سنتا ہے۔ صرف سلانے والے کی آواز سنتا ہے۔ بلکہ سلانے والے سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ اگر سلانے والے کے جسم میں سوئی چبھو دی جائے تو ممکن ہے کہ واسطہ کو احساس ہو جائے اور آپ تعجب نہ کریں کہ اگر سلانے والے پر خوشی و سعادت کا احساس ہو جائے یا سلانے والا بحر غم میں ڈوب جائے یا غصہ میں بھر جائے تو واسطہ بھی خوش و مسرور یا غمگین و غضبناک ہو جایا کرتا ہے۔

مصنوعی نیند میں آدمی ایسی زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے جسے وہ جانتا بھی نہیں تھا۔ اور اس کا علم صرف اپنے آس پاس ہی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ اس کی روح دور دور تک منتقل ہو جاتی ہے اور یہ تمام باتیں مادی حضرات کی تفسیر سے کسی بھی طرح مطابق نہیں ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں واسطہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ سلانے والے کے تلقین و تفہیم کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ واسطہ اپنا ارادہ کھو بیٹھتا ہے ______ حالانکہ یہ ایک دوسری چیز ہے۔ مادی علوم جو بیان کرتے ہیں اس سے بالکل ہی الگ چیز ہے اور وہ حقیقت ہے جو انسان کے

وجود میں مخفی ہوتی ہے اور اس کے ایسے آثار ہو جاتے ہیں جن کا مادی قوانین پر قیاس ناممکن ہے اور جو شخص بھی واقع میں بحث کرے گا اور تحقیقات میں غور و فکر کرے گا وہ رفتہ رفتہ اس حقیقت کا قائل ہو جائے گا۔

پس یہ کون سی طاقت ہے جو دوسرے انسان کے ارادے پر غالب آ جاتی ہے اور دوسرے کے اعضاء کو حس و حرکت سے معطل بنا دیتی ہے؟ اور اگر انسان غور کرے تو کیا اس پر واضح نہیں ہوگا یہ ایک روح کے آثار ہیں جو فنا نہیں ہوتی؟ اور پھر کیا عینی شواہد کی بنیاد پر کلی قانون وضع کرنا علمی اسلوب کا ایک نمونہ نہیں ہے؟ اور کیا جو لوگ عالم کے سلسلے میں ظن پر عمل کرتے ہیں ان کے لئے راستہ کا کھونا نہیں ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس سلسلے میں جدید انکشافات مادی حضرات کے مبنی بر توہم عقائد کی دھجیاں اڑا دے گا۔

یہ بات درست ہے کہ (ظاہرۃ التیپاتی) کے بعد انتقالِ افکار کے سلسلہ میں لوگوں کو تھوڑی بہت معرفت ہو گئی تھی لیکن ۱۸۸۲ء کے پہلے علمی طور سے اس کی تحقیق نامکمل تھی لیکن اس تاریخ کے بعد انگلستان میں "انجمن تحقیقات نفسیہ" نے اس موضوع پر اپنے منظم و دقیق تجربات کر کے اس حقیقت کو ثابت کر دیا۔

دو شخصوں کے درمیان تبادلۂ افکار ممکن ہے چاہے دونوں ایک دوسرے سے دور ہوں یا قریب! اگر دونوں قریب ہوں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ جائیں اور پھر کچھ بولے یا اشارہ کئے بغیر ایک دوسرے کی طرف اپنی فکروں کو منتقل کر دیتے ہیں — لیکن اگر دونوں دور ہوں — دوری کا فاصلہ معین نہیں ہے چاہے جتنا دور ہوں — تو وقت معین پر ایک مخصوص موضوع پر اپنے اپنے افکار کو مرکوز کر دیں گے اور فکروں کی امواج کو بھیج کر ایک دوسرے کی افکار کو سمجھ لیں گے۔

یہ باتیں — جن کا ماہرینِ فن نے کائنات کے مختلف حصوں میں تجربہ کر کے اس کی

صحت کا اعتراف کیا ہے ——— روح کی عجیب تجلیات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اپنے نشاط کو مستقل شکل سے اختیار کرتی ہے۔

ان تمام شواہد کے بعد ہم کیوں نہ اس بات کی تصدیق کریں کہ ہمارے نشاط بدن پر جو قوت مسلط ہے وہ بنیادی طور سے مادی قوتوں سے بالکل الگ ہے۔

نفسیات کے عالم گینگٹن GANIGTO. کے حسب ارشاد

دماغ کا وجود اور اس کا عمل بدن کے خارج چیزوں پر نا ممکن ہے چاہے وہ بدن سے صرف چند سنٹی میٹر کے فاصلے پر ہوں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ معدہ کا نظام یا خون کے مکیوبات بدن سے خارج چیزوں پر عمل کریں تو ظاہر ہے کہ نا ممکن ہے اسی طرح ناممکن فیہ بھی ہے

مشہور مفکر ہنری برگسون۔ (HENRI BREGSON)

کہتے ہیں، اگر ہم اس فرض کو تسلیم کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ "علم روحی" جن واقعات کا تذکرہ کرتا ہے وہ سب کے سب یا کم از کم بعض تو مسلّمۃ الوقوع ہیں۔ بلکہ ہمیں تو اس پر تعجب ہے کہ ہم لوگوں نے اتنی طویل مدت تک اس کی تحقیقات کی ابتدا کیوں نہیں کی۔ یہاں پر اگرچہ ہم اس نقطہ پر بحث نہیں کریں گے جسے دوسری جگہ ذکر کر چکے ہیں۔ لیکن ہم اس چیز کے بارے میں "جو دوسروں سے بنیادی طور پر بہت ہی مضبوط ہے" اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر ہم ظاہرات تخاطر ——— ٹیلیپاتھی ——— کی حقیقت کے بارے میں ہزاروں موافق شہادتوں کے بعد شک کرتے ہیں تو پھر ہمیں اعلان کر دینا چاہیے کہ انسانی گواہی عام طور سے علم کی نظر میں قابل قبول نہیں ہے پھر اس وقت تاریخ کا مصرف کیا ہوگا؟ البتہ ایک ایسا انتخابی آپریشن ضروری ہے جس سے ہم ان نتائج میں تمیز کر سکیں جن کو "العلم الروحی" پیش کرتا ہے اور خود سب کو ایک ہی مرتبہ میں قرار نہیں دیتا بلکہ وہ ان

چیزوں کے بارے میں جو محقق ہیں اور ان چیزوں کے بارے میں جو محتمل اور ممکن ہیں تمیز کرتا ہے۔ مگر ہم ابھی تک صرف اس تھوڑے سے حصہ پر عمل کرتے ہیں جسے وہ یقینی طور سے پیش کرتا ہے۔ اور اس کے بعد ہمارے پاس ایک بہت وافر مقدار باقی رہ جاتی ہے جو ہمیں اس بات پہ آمادہ کرے گی کہ ہم اس وسیع زمین کو ارض مجہول کی وسعت کے برابر فرض کریں جس کی ابتداء جو یان منزل کریں گے۔[1]

انسان کی روز بروز علمی ترقی نے آج وہاں بھی کند ڈالنے کی کوشش کی ابتدا کر دی ہے جو انسان سے دور دکھائی دیتا ہے یعنی ستارے اور آج اس کے فطری حالات اور مادی اعراض کی تحقیق کی طرف منہ موڑ دیا ہے۔ اب انسان ان خصائص کو بھی کھنا چاہتا ہے جو اس کے وجود پہ غالب ہیں اور نہ صرف کھنا بلکہ ان کی تشخیص بھی کرنا چاہتا ہے۔

انسان کے عام حالات اور جن کی طرف اس کے افکار بھی متوجہ ہیں وہ "رویا اور خواب" کا مسئلہ ہے اور چونکہ انسان کی زندگی کا کافی حصہ سونے میں گزر جاتا ہے لہٰذا وہ خواب کی دنیا کی معرفت بھی چاہتا ہے۔

خواب کے سلسلہ میں جو مختلف رائیں ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک حساب سے یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے اور ایک اعتبار سے دلالت کرتا ہے کہ محققین نے اس میدان میں کافی تحقیقات کی ہیں۔

ہر زندہ موجود اس خاصیت سے متمیز ہے کہ کوشش و سعی کے بعد تھک جاتا ہے اور تھکن کے نتیجے میں نیند کے دریا میں ڈوب جاتا ہے اور نیند کی حالت میں ایک طرف تو اس کے حیاتی تشغلات معطل ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف بدنی کوششیں سست رفتاری کی طرف

---

[1]: منبعاث الاخلاق والدین ص ۳۴

مائل ہو جاتی ہیں۔

لیکن نیند کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اس سلسلہ میں علماء کی تمام تحقیقات بھی ابھی تک کوئی یقینی جواب نہیں تلاش کرسکیں، اور یہ موضوع اب تک ایسے مختلف نظریات کے تحت مدفون رہا جن میں اکثر غیر صحیح اور جلد بازی کا نتیجہ ہیں، اس سلسلہ میں علمی معرفت جسم کے بعض ان انکشافات تک محدود ہے جو بدن کے چھوٹے میں جاری ہیں۔ اگرچہ کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے اس راز کے کشف یا کامیابی کا ایسا کوئی جواب مل جائے جو اس گہرے موضوع کا جامع ہو، اور یہ بات بھی جلد بازی کی ہوگی کہ ہم یہ پیش گوئی کریں کہ مستقبل کی دقیق اور واقعی ذہنیں اس مہم کو سر کرلیں گی۔ البتہ یہ ضرور احتمال دیا جاسکتا ہے کہ انسان کی علمی نشاط میں وسعت پیدا ہو جائے اور مرور ایام کے ساتھ اس کے انکشافات میں اضافہ ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں اس موضوع کے اردگرد جو اسرار پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے کچھ کے حل میں کامیابی ہو جائے۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ "خواب" سے زیادہ مخفی راز بھی موجود ہیں مثلاً مستقبل میں پیش آنے والے مختلف حوادث اور مختلف تصویریں نیند میں ڈوبے ہوئے انسان کے سامنے مجسم ہو کر آجاتی ہیں اور اس قسم کے امور بھی پیچیدہ اور گہرے مسائل کے سامنے لاکھڑا کر دیتے ہیں۔

اور خواب میں تمام نشاطات فیسیولوجی اور امور غیر ارادی اپنی منظم شکل میں مسلسل نظروں کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ پس تمام اعصاب، غدود، شریانیں، امعاء، اور نسیں اپنے کام میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن خود انسان خواب کی حالت میں نہ تو غور و فکر کرسکتا ہے نہ کوئی تقریر کر سکتا ہے، اور اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔ اس وقت انسان کی حالت ان موجودات کی زندگی سے بہت مشابہ ہوتی ہے جو صرف ایک خلیہ کے مالک ہوتے ہیں۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لمبا لمبا لیٹا ہوا جسم ہے جس کے اندر کوئی زندگی نہیں ہے لیکن یہی شخص دفعتاً اٹھ بیٹھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو زندہ ہے اور یہ دونوں

خواب اور اس سے بیداری ——— حالتیں موت اور بعث کا چھوٹا سا نمونہ ہیں۔

خود قرآن مجید موت اور نیند کے درمیان ایک قسم کی وجہ شبہ بیان کرتا ہے اور بیداری اور بعث کے درمیان ایک اور قسم کی وجہ شبہ بیان کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (س الزمر آیت ۴۲) خدا ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ بلاتا ہے اور جو لوگ نہیں مرے (ان کی روحیں) ان کی نیند میں (کھینچ لی جاتی ہیں) بس جن کے بارے میں خدا موت کا حکم دے چکا ہے ان کی روحوں کو روک رکھتا ہے اور باقی (سونے والوں کی روحوں) کو پھر ایک مقررہ وقت تک کے واسطے بھیج دیتا ہے جو لوگ (غور و) فکر کرتے ہیں ان کے لئے (قدرت خدا کی) یقینی بہت سی نشانیاں ہیں ———

پس قرآن کی نظر میں نیند چاہے ظاہر میں قوائے طبیعیہ کی تعطیل ہی کیوں نہ ہو مگر روحانی اعتبار سے یہ باطن کی طرف رجوع ہے۔ پس نیند چھوٹی سی موت ہے اور موت لمبی نیند ہے اور روح دونوں صورتوں میں ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ان دونوں (موت و نیند) میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ انسان سو کر اٹھنے کے بعد اس بات کی طرف غالباً نہیں ملتفت ہوتا کہ وہ سفر سے پلٹا ہے لیکن موت کے بعد تمام حالات اس کے سامنے واضح و روشن ہو جائیں گے۔

روحانی فلسفیوں نے خوابوں کی تقسیم باب باب کر کے کی ہے اور ان میں سب سے بڑی قسم یہ ہے کہ خواب انسان کی امیدوں اور خواہشات کے ارد گرد گھومتا ہے یا پھر ان واقعات کے گرد گھومتا ہے جو اس پر گزر چکے ہیں۔ اور دوسری قسم خواب کی وہ خوابہائے پریشان

ہوتے ہیں۔ جو انسان کے توہمات اور تخیلات کی پیداوار ہوتے ہیں۔

اور تیسری قسم خواب کی وہ ہوتی ہے جس کا بنیادی بیج الہام ہوتا ہے اور یہ خواب مستقبل میں ہونے والے واقعات کی نشاندہی کرتا ہے البتہ یہ تیسرے قسم کے خواب کبھی تو ممکن واقعات کو حقیقی شکل و صورت میں ظاہر کر دیتے ہیں اور کبھی رمزی اور اشارتی قالب میں ہوتے ہیں جن کی حقیقت وہی لوگ بیان کر پاتے ہیں جو تعبیر خواب کے ماہر ہوتے ہیں۔

چونکہ روح کی اصل عالم ماورائے طبیعت سے متعلق ہے، اس لئے نیند کی حالت میں — یعنی جب وہ حسی ادراکات میں مشغول نہیں ہوتی — ایک وسیع عالم کی طرف سفر کر جاتی ہے اور اپنی استعداد و ظرفیت کے لحاظ سے بعض حقائق کا اس عالم میں مشاہدہ کرتی ہے اور اس میں یہ بھی استطاعت ہوتی ہے کہ ان معلومات کو ذہن میں ذخیرہ کر دے اور پھر بیداری کی حالت میں وہ سب یاد آ جائے — لیکن ان خوابہائے پریشان کا کوئی اعتبار اور نہ کوئی قیمت ہے جو جسم و روح کے حالات سے مرتبط ہوتے ہیں، کیونکہ یہ صرف اوہام و خیالات ہوتے ہیں یا گزرے ہوئے واقعات کے تصورات ہوتے ہیں یہ مستقبل کے حالات بالکل نہیں بتا سکتے — اب رہے وہ خواب جن کی بنیاد پر مستقبل کی خبر دینا ممکن ہوتا ہے یا وہ خواب جو اتنے واضح ہوتے ہیں کہ ان کی تعبیر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور یہ وہ خواب ہوتے ہیں جو عالم مثال کی علل و اسباب کو بیان کرتے ہیں اور ان واقعات کی صورت کی عکاسی کرتے ہیں جو مستقبل قریب میں یا بعید میں ہونے والے ہوتے ہیں تو یہ دونوں — جو مستقبل کے حالات بتاتے ہیں اور جو کبھی اپنی وضاحت کی وجہ سے محتاج تعبیر نہیں ہوتے — تاریخوں میں بکثرت بیان کئے گئے ہیں اور بہت سے افراد کو مخصوص حالات میں ایسے خواب دکھائی دیتے ہیں اور یہ اتنے زیادہ ہیں کہ انہیں "اتفاقاً" کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا پس اس قسم کے خواب نہ تو اقسام مذکورہ میں سے ہیں اور نہ جہاز عصبی کے تحلیلات کے

مرحلوں میں جو روزانہ ہمیں درپیش ہوتے ہیں لہٰذا خواہشات و آرزوؤں کا اسی قسم کے خوابوں میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔

فروید خوابوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

خواب میں ہماری نظروں کے سامنے صرف ہمارے وہ احساسات اور خواہشیں آتی ہیں، جنہیں ہم نے دن میں سوچا تھا لیکن کسی وجہ سے ہم اس کو پورا نہ کر سکے یا ہمیں اس کے پورا کرنے سے روک دیا گیا پس جس شخص کا ہاتھ فلاں عورت تک دن میں نہیں پہنچا تو وہ خواب میں اس عورت پر غالب آتا ہے۔ ایک فقیر اور بھوکا آدمی خواب میں مالدار کو دیکھتا ہے جو ایک شہر بھر کا مالک ہے، بدصورت آدمی اپنے کو بہت ہی خوبصورت دیکھتا ہے، بڈھا اپنے کو جوان دیکھتا ہے، مایوس خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کی تمام خواہشیں پوری ہو گئیں، مختصر یہ کہ وہ تمام خواہشات جو دن میں پوری نہیں ہو پاتیں اور وہ تمام احساسات جن کا کسی سبب سے چھپانا ضروری ہوتا ہے وہ سب خواب میں دکھائی دیتے ہیں[1]

اب میں بہت سے ان خوابوں کے ذکر سے اعراض کروں گا جنہوں نے مستقبل کے حالات بیان کئے ہیں اور جنہیں تاریخوں میں لکھا گیا ہے یا جنہیں معتبر اشخاص سے نقل کیا گیا ہے یا جنہیں خود میں نے بہت ہی معتبر لوگوں سے سنا ہے۔ میں صرف اپنا ایک خواب بیان کروں گا

سن ۱۳۴۹ ھ شمسی ۲۴ فروری (۴ اردیبہشت) روز یکشنبہ کو شہر (لار) میں ایک شدید زلزلہ آیا جس کے سبب سے بہت سے نقصانات ہوئے اور اس واقعے سے تقریباً ایک ہفتہ قبل ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عظیم زلزلے نے شہر (لار) کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ جس سے مکانات منہدم ہو گئے اور اتنا شدید گرد و غبار بلند ہوا کہ آسمان چھپ گیا۔ اور اسی

---

[1] فروید ص ۲۳

ہولناک منظر کو دیکھ کر جس نے میرے اعصاب کو بُری طرح سے متاثر کر دیا تھا، میں خوفزدہ ہو کر بیدار ہو گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ آدھی رات کے بعد کا خواب ہے دوسرے دن میں نے اپنے اس خواب کو کئی محترم شخصیتوں سے بیان کیا اور بعض قریبی دوستوں سے بھی اس کا ذکر کیا اور یہ حضرات اب تک اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ لوگوں نے میرے خواب کی مختلف تعبیریں بیان کیں دو یا تین راتوں کے بعد ایک شدید زلزلہ لار میں آیا لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا اور جس رات یہ زلزلہ آیا اس کی صبح کو ایک بزرگوار عالم میرے پاس آئے۔ ان سے بھی میں اپنا خواب بیان کر چکا تھا۔ اور فرمایا کہ کل رات جو زلزلہ آیا یہ وہی ہے جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے عرض کیا جو خواب میں نے دیکھا تھا وہ بہت عظیم تھا اس نے شدید نقصانات پہنچائے تھے یہ چھوٹا سا زلزلہ اس سے مشابہ نہیں ہے، یہ بزرگوار اب تک اس موضوع کا ذکر کرتے ہیں۔

اور پھر جب ۲۰ اردیبہشت آئی اور اس دن شام کے قریب ایک ایسا زلزلہ آیا جس نے شہر لار کو الٹ پلٹ کے رکھ دیا، مکانات منہدم کر دیئے، افق تک غبار ہی غبار چھا گیا، بہت سے مرد، عورتیں، بچے، چھوٹے بڑے ہلاک ہو گئے۔ اور جو لوگ اس زلزلہ سے بچ گئے وہ منہدم مکانات کی طرف دوڑے تاکہ زخمیوں کی امداد کریں اور میں نے اس وقت ایسے مناظر دیکھے جنہوں نے مجھے جھنجوڑ ڈالا۔ اور لوگوں پر اس کا بہت زبردست اثر ہوا۔

اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میں نے خواب میں اپنے ایک رشتہ دار بچے کو دیکھا تھا جو ہمارے پڑوس میں رہتا تھا کہ وہ ایک مکان کے پاس سے گزر رہا ہے اور وہ مکان شکستہ ہو کر گر رہا ہے تو میں چیخا بھاگو بھاگو اور وہ لڑکا بھی خطرے کی جگہ سے دور ہو گیا۔

اور جب یہ زلزلہ آیا تو جس مکان کو میں نے جس طرف سے گرتے ہوئے دیکھا تھا وہ اسی طرف سے منہدم ہوا اور باقی مکان اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا اور اس بچے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا جسے خواب میں دیکھا تھا اور بھاگنے کی ہدایت کی تھی اور جب میں نے اس لڑکے سے پوچھا تو

اس نے بتایا کہ زلزلہ شروع ہوتے وقت میں مکان کے اسی حصّے کے پاس سے دوڑ رہا تھا، جو گرا ہے۔ لیکن جب حصہ گرا تو میں اس سے دُور نکل چکا تھا۔

اب آپ ہی سوچئے کہ ایسے خواب جو مستقبل کی عکاسی کرتے ہوں اور مستقبل کے چہرے سے نقاب اٹھا دیں تو ان کی منطقی تحلیل یہی ہے کہ ہم مادی حضرات کی تفسیروں کو قبول کرلیں؟ اور یہ تسلیم کرلیں کہ یہ سارے خواب روزانہ کی عادی زندگی کے مجسّم اعمال کا نتیجہ ہیں یا ان سب کا سبب بعض امور سے خوف ہے؟

اور کیا یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے خواب ــــــ جیسا کہ فرویڈی مذہب کے لوگ مدعی ہیں ــــــ الٹی خواہشات اور انا کی دھوکہ دہی سے پیدا ہوتے ہیں اور شعور میں یہ اسی طرح ظاہر ہوتے ہیں!

آخر قوتِ ادراک ان حوادث کا ادراک کیونکر کرلیتی ہے جو موجوداتِ مادیہ کی دوڑ سے خارج ہوتے ہیں؟ اور ان واقعات کی معرفت کیونکر حاصل ہو جاتی ہے جو ایک مدت کے بعد ظاہر ہونیوالے ہوتے ہیں؟ کیا یہ علم اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نفس انسانی عالم مجردات سے ارتباط رکھتا ہے؟ اور اس کے علاوہ کوئی معقول تفسیر ممکن ہے!

پس انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی خبروں کو کسی بھی طرح سے عالم غیب اور ایسے منبع سے حاصل کرے جو مستقبل پر مطلع ہو۔ اور اس طرح بعض واقعات کے سلسلے میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ پس جس طرح انسان کہکشاؤں سے بھیجی ہوئی امواج کو رصدگاہوں کے ذریعے محفوظ کرلیتا ہے اور اس سے بعض مجہولات کا علم حاصل کرلیتا ہے۔ اسی طرح وہ انسانی روح کے ذریعے جو ایک واسطہ ہے عالم غیب کی موجوں کا کیوں نہیں استقبال کر سکتا؟ اور خواب کے ذریعے بعض مجہولات کو فطری طریقہ سے کیوں نہیں حاصل کر سکتا؟ اس میں آخر کیا چیز مانع ہے؟

اب ذرا مادی مذہب کے لیڈروں کے خیالات بھی سن لیجئے جو عام طور پر خواب کے بارے میں کہتے ہیں : قرون ماضیہ کے برعکس خواب نہ تو مستقبل کی خبر دیتا ہے اور نہ ہی کسی راز سے پردہ اٹھاتا ہے، اجبکہ واقعی طور سے تو اس کی کوئی صحیح تفسیر ہی نہیں ہے، اور اگر ہم فرویدی مذہب کے قائل ہو جائیں تو معاملہ بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے کیونکہ خواب میں گزشتہ واقعات ہی کی عکاسی ہوتی ہے اور خواب صرف ان واقعات کا نتیجہ ہوتا ہے جو گزر چکے ہیں۔ مستقبل کی خبر کسی بھی صورت میں نہیں دیتا۔ اور خواب کے موضوع میں عمیق تحقیقات کا نتیجہ ــــ تمام روحانی واقعات کی طرح ــــ خالص مادی چیز ہوتا ہے اور اس میں ماورائے طبیعت کی کوئی بھی قوت اثر انداز نہیں ہوتی[1]

کیا یہ صحیح بات ہے کہ ہمارے خواب نہ تو مستقبل کی خبر دیتے ہیں اور نہ ہی مطلقاً مخفی امور کی خبر دیتے ہیں؟

یہ لوگ تو وہ آزاد خیال ہیں کہ جب کسی واقعی چیز یا خواب کی تفسیر کا انکار کرنے پر آتے ہیں ــــ یعنی ایسی خواب کی تفسیر جو کسی بھی طرح آج کے افکار کے مطابق نہیں ہوتی ــــ تو پھر اس کی غیر واقعی تفسیر کرنے لگتے ہیں۔

یہ گروہ جس کا دعویٰ یہ ہے کہ ــــ ان کی تمام افکار منزل کمال تک پہنچی ہوئی ہیں اور ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وجود کے گہرے ترین رازوں تک اُن کی رسائی ہے، اور انسان کے ظاہر و باطن پر جو قوانین مسلط ہیں ان سب کا احاطہ کر لیا ہے اور اس گروہ کے نزدیک اطراف عالم میں اب کوئی پوشیدہ راز نہیں رہا ہے۔ اور اس گروہ کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ لوگ جو بھی قضایا پیش کرتے ہیں وہ سب منطقی ہوتے ہیں اور ان کی

---

[1] : خوابیدن وخوابیدن (النوم الحلم) ڈاکٹر ارانی ص ۱۵ ـــ ۲۱

پیروی واجب ولازم ہے ــــ تو یہ لوگ ہر شخص سے مستغنی ہیں اور ان کے نزدیک تمام رازوں سے پردہ اٹھ چکا ہے ــــ

لیکن ان حضرات کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اس طرح حقائق کا مقابلہ کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کے پاس بدیہیات سے بھی سرکشی جائز ہے اور جس حقیقت کا اثبات ہو چکا ہے یہ لوگ اس سے بھی نفرت کرتے ہیں۔

مادی مذہب کے ماننے والوں کی ایک عام عادت یہ بھی ہے کہ دوسروں کی فکروں کی بنیادوں کو ملیامیٹ کر دیں اور تمام وہ باتیں جو ان کی منطق کے مطابق نہ ہوں فوراً ہی اپنی تنگ نظری سے اس کی من مانی تفسیر کرنے لگتے ہیں، یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان کا مذہب دقیق ترین اور پیچیدہ ترین مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے۔ حالانکہ اگر تحقیق میں ذرا تأمل سے کام لیا جائے اور فکر میں جلد بازی نہ کی جائے اور تھوڑی سی توجہ سے بھی کام لیا جائے تو واقعی غیر محسوس امور اس تصدیق کے دائرہ کو تنگ کر دیتے ہیں جو ذات السعد لواحد ہو اور تفکیر انسانی کی وسعت پر معین و مددگار ہوتے ہیں۔

اس بات کی طرف بھی اشارہ مناسب ہے کہ الہی مفکرین ایجاد رؤیا کے سلسلہ میں تمام خارجی و باطنی عوامل، امیدوں، خواہشوں، افکار ماضیہ، ادراکات کی تاثیر کا انکار نہیں کرتے۔ (اور ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ) بہت سے مختلف امراض اور اختلال مزاج کی وجہ سے بھی بہت سے خواب دکھائی دیتے ہیں ــ لیکن یہ بھی درست نہیں ہے کہ تمام کے تمام خواب بے ربط خواہشات، دماغی اور عصبی نشاطات ہی کی عکاسی کرتے ہیں، بلکہ بہت سے خواب ایسے ہوتے ہیں لیکن مستقبل کی خبر دینے والے خوابوں کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ لہذا ماننا پڑے گا کہ موضوع اتنا آسان نہیں ہے۔ ہم نے تو خود بہت سے ایسے خواب دیکھے ہیں جو مخفی حوادث اور مستقبل کی خبر دیتے ہیں

اور اگر ہم اس سلسلے میں صرف مادّی عامل ہی پر اختصار کریں تو کوئی قانع جواب نہیں ملے گا۔ کیونکہ بعضوں کی ماہیت اور جوہر دوسری حقیقت کے بجز ہوتے ہیں اور ذات العبدالواحد کا نظریہ اس کی تفسیر و توضیح سے عاجز ہے۔

اسی طرح مرتاضین (جیسے بعض سادھو وغیرہ انڈیا میں ہوتے ہیں) کے محیر العقول کارناموں کو سطحی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے اور نہ ادھر سے خاموشی سے گزر جانا چاہیئے یہ حضرات ــــ سادھو اور پنڈت وغیرہ ــــ بھی ایسے عجیب و غریب اعمال کا مشاہدہ کراتے ہیں جن کو لوگوں نے خود دیکھا ہے۔ یا گزشتہ لوگوں کی کتابوں میں پڑھا ہے۔

اگر ہم روح کو صرف (ظاہرہ مادیّہ) مان لیں تو یہ سارے واقعات ــــ جو باطنی مخفی قوتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کہرے کے سمندر میں ڈوب جائیں گے ــــ لہٰذا ہم نے جن مسائل کو بحث کے لئے پیش کیا ہے وہ سب ایک ایسی حقیقت مستقلہ ــــ روح ــــ کے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو غیر فانی ہے اور اس پر موت طاری نہیں ہوتی۔ اور اسی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ حقائق کی معرفت گہرے تفکر کے بغیر ناممکن ہے حقیقت کی معرفت کے لئے گہرا تفکر ہی بہترین راستہ ہے۔

اگر ہم انسان کی تشبیہ ایک ایسے ہوائی جہاز سے دیں جو مختلف اجزاء سے بنایا گیا ہو اور اس کا ہر جزو ایک مخصوص فعل انجام دیتا ہو اور مخصوص ذمہ داری کا حامل ہو تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ہوائی جہاز بنیادی طور سے ایک ایسے پائلٹ کا محتاج ہوگا جو تجربہ کار ہو اور اپنے فن و مہارت کی وجہ سے اس کی قیادت کر سکے اور یہ بھی ضروری ہے کہ پائلٹ ان اجزاء میں سے نہیں ہونا چاہیئے جن سے ہوائی جہاز بنایا گیا ہے اور نہ ہوائی جہاز کے آلات میں سے ہو لیکن پائلٹ کا ہونا بہر حال ضروری ہے۔ ہوائی جہاز کا منزل مقصود تک پہنچانا پائلٹ کے بغیر ناممکن ہے۔

ہر شے اپنی آخری منزل تک پہنچے گی

یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ موجودہ نظام عالم ایک دن عظیم حادثہ سے دو چار ہو جائے گا
یہ کائنات جو انسان کی سعی مسلسل کی تمام عمر جولان گاہ رہی ہے اور جس میں انسان طبیعت کی
ایک تسخیر کے بعد اس سے بڑی تسخیر کی طرف منتقل ہوتا رہا ہے۔ اور اس کی کند صرف زمین
تک محدود نہیں رہی ہے وہ تو اس سے آگے کی تسخیر کر رہا ہے اور اسی لئے اس کی کمند
زمین سے گزر کر سمندر کے سینوں تک اور فضا کے بسیط تک ہو گئی ہے۔ یہی کائنات آخر میں
ایک خوفناک انجام سے دو چار ہو گی اور ایک فاجعۂ عظیم کے ماتحت ناپید ہو جائے گی۔

اور جب وہ عظیم دھماکہ ہو گا تو آسمانوں کے ستارے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے، ستاروں کی
روشنی ختم ہو جائے گی، بڑے بڑے پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور قرون عدیدہ میں
جمع ہو جانے والی چیزیں روئی کے گالے کی طرح بکھر جائیں گی، سمندروں میں ہیجان پیدا
ہو جائے گا، قبروں سے مردے نکل پڑیں گے اور زمین حکم خدا کی اطاعت کرے گی زمین
تمام وہ خزانے جو ایک مدت دراز سے اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہے اسے واپس
کرے گی اور اس ثقیل بوجھ سے ہلکی ہو جائے گی اور آخر میں کائنات عظیم گرد و غبار کا مجموعہ
بن کے رہ جائے گی۔ اور گویا پوری کائنات ایک عظیم ہتھوڑے سے پیس دی جائے گی۔

یہ پراگندگی، انتشار، عناصر کا اختلاط اس طرح ہو گا کہ ایک کا دوسرے سے تمیز کرنا ناممکن
ہو جائے گا۔ ہماری کائنات کا یہ انجام ہو گا۔ خود قرآن مجید انسان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے
کہ یہ نظام ایک معین مدت کے لئے ہے یہ ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے: ملاحظہ کیجئے!

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا فِي أَنفُسِهِم مَّا خَلَقَ اللَّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا

بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ (س روم آیت ۸) کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں اتنا بھی غور نہیں کیا کہ خدا نے سارے آسمان وزمین کو اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں بالکل ٹھیک اور مقرر میعاد کے لئے پیدا کیا ہے اور بہتیرے لوگ تو اپنے پروردگار کی (بارگاہ) کے حضور (قیامت) ہی کو کسی طرح نہیں مانتے ـــــــــ

اور دوسری طرف قرآن یہ بھی اعلان کر رہا ہے کہ ان احداث کا ہونا حتمی ہے اور جس دن ہر موجود کے جسم سے لباسِ زندگی اتار لیا جائے گا اس دن نہ تو کوئی شخص اور نہ ہی کوئی شئے ذاتِ پروردگارِ عالم کے علاوہ باقی رہے گی ـــــــــ آئیے ذرا قرآن کی زبانی اس ہولناک منظر کی تصویر کشی دیکھیں اور اس عالم کا مستقبل کیا ہوگا اس کی طرف توجہ دیں ارشاد ہوتا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۔

(س الحج، آیت ۱، ۲) اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو (کیونکہ) قیامت کا زلزلہ (کوئی معمولی نہیں) ایک بڑی (سخت) چیز ہے جس دن تم اسے دیکھ لوگے تو ہر دودھ پلانے والی (ڈر کے مارے) اپنے دودھ پیتے (بچے) کو بھول جائے گی اور ساری حاملہ عورتیں اپنے اپنے حمل (مارے دہشت کے) گرا دیں گی اور (گھبراہٹ میں) لوگ تمہیں متوالے معلوم ہوں گے، حالانکہ وہ متوالے نہیں ہیں بلکہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے کہ لوگ بدحواس ہو رہے ہیں)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَاۗءً مُّنْۢبَثًّا (س واقعہ آیت ۴ تا ۶) جب زمین بڑے زوروں میں ہلنے

لگے گی اور پہاڑ (ٹکرا کر) بالکل چورچور ہو جائیں گے پھر وہ ریت بن کر اڑنے لگیں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے: یَسْئَلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ۝ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ (س قیامت آیت ۶ تا ۱۰) پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا تو جب آنکھیں چکا چوندھ میں آجائیں گی اور چاند میں گہن لگ جائے گا اور سورج چاند اکٹھا کر دیے جائیں گے تو انسان کہے گا کہ آج کہاں بھاگ کر جاؤں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (س مرسلات آیت ۸ تا ۱۰) پھر جب تاروں کی چمک جاتی رہے گی اور جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب پہاڑ (روئی کی طرح) اڑے اڑے پھریں گے

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے: اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (س انفطار آیت ۱ تا ۴) جب آسمان ترخ جائے گا اور جب تارے بکھر جائیں گے اور جب دریا بہہ کر (ایک دوسرے سے) مل جائیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔

ماہر فلکیات نکولس کامیلے فلاماریون NICOLAS CAMMILLE FLAMMARION

اپنی کتاب (نہایۃ الدنیا) میں کہتا ہے۔ اپنی پوری ہیبت و جلال کے ساتھ (اس کرۂ ارض میں) زندگی نظام شمسی کے قوت جاذبۂ عام اور قوت مرکز گریز طاقتوں کے تعیت کا نتیجہ ہے کیونکہ قوت جاذبۂ عام تمام اجزائے عالم کو ــــ ذرات سے لیکر ستاروں تک ــــ ایک دوسرے سے مرتبط کرتی ہے۔ اور قوت مرکز گریز طاقت ان کی حرکتوں کو

ضبط و نظم میں رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام اطراف عالم میں ایک عام نظام کو پھیلاتی ہے۔ لیکن یہ پورا نظام ــــ نظام شمسی ــــ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ایک دن درہم برہم ہوجائیگا اور ستارے اپنی موت مر جائیں گے۔ اور ہار کے ٹوٹے ہوئے موتیوں کی طرح تمام ستارے ادھر ادھر بکھر جائیں گے۔

روایات اور آیات سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پورا نظام کسی ایسے حادثہ کی وجہ سے جس کا علم ہمیں نہیں ہے۔ دفعتاً بکھر جائیگا اور دفعتاً سورج، ستاروں اور نظام تکوینی کی عمر ختم ہو جائے گی۔

فلکیات کا انگریز عالم ریل RAIL کہتا ہے کہ یہ کائنات

دس ہزار ملیون سال یا پندرہ ہزار ملیون سال پہلے ایک عظیم انفجار کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہے اس انفجار نے اپنی آدھی طاقت یا مادہ کو اس لئے صرف کر دیا کہ ستارے فضا کے اطراف میں پہنچ جائیں اور کہکشاؤں میں آدھی طاقت محفوظ کر دی جو آخری انفجار میں کام آئیگی

قرآن کہتا ہے: يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (س انبیاء آیت ۱۰۴) (یہ) وہ دن (ہوگا) جب ہم آسمان کو اس طرح لپیٹیں گے جس طرح خطوں کا طومار لپیٹا جاتا ہے ــــ اسی طرح قرآن کا اعلان ہے، وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (س تکویر آیت ۶) اور جس وقت دریا آگ ہو جائیں گے، تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ (س معارج آیت ۸) جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا۔

یہ دونوں (دوسری اور تیسری) آیتیں سابق علماء کے نظریات کی مخالفت کرتی ہیں: کہ دنیا کی عمر کا خاتمہ درجۂ حرارت کے گھٹ جانے اور موجودات کے منجمد ہو جانے کی وجہ سے

ہوگا ــــــ لیکن یہ دونوں آیتیں بتاتی ہیں کہ قیام قیامت کے دوران سورج کی حرارت اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ کوئی موجود زندہ نہیں رہ سکے گا۔

اور آج ــــــ جبکہ علم کی ترقی اپنے عروج پر پہنچ چکا ہے ــــــ کے ماہر علماء ــــــ اپنی معرفت کے مطابق ــــــ اس دن کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں:

چنانچہ جورج گاموف مشہور محقق کہتا ہے

زمانے کے گزرنے کے ساتھ سورج کی شعاعوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے اور جس وقت سورج میں موجود ہائیڈروجن ختم ہو جائے گا تو شعاعی طاقت سو گنا بڑھ جائے گی۔ اور اسی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سورج کی طاقت کے سلسلے میں تحقیق کلاسیکی رسمی نظریہ کے بالکلیہ مخالف ہے ــــ

اس کہنے کے بجائے کہ سورج میں فعل و انفعال کی کمی کی وجہ سے ایک دن ایسا آئیگا کہ ساری چیزیں منجمد ہو جائیں گی ہمیں یہ کہنا چاہیئے کہ سورج کی حرارت بڑھ جانے کی وجہ سے اس کرۂ پر زندگی ختم ہو جائے گی۔

سطح زمین کی حرارت اس درجہ تک پہنچ جائے گی جس درجہ پہ پانی کھولنے لگتا ہے اور اگر پہاڑ اور جامد زمین کا اوپر کا حصہ اس گرمی سے نہ بھی پگھلا تو اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ سمندروں کا پانی کھولنے لگے گا۔ اور چونکہ تمام زندہ موجودات کھولتے ہوئے پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا درجۂ حرارت جتنا بڑھتا جائے گا زندہ موجود ختم ہوتی جائے گی اور احتمال قوی ہے کہ درجۂ حرارت کے ناقابل برداشت حد تک پہنچنے سے پہلے پہلے زندہ موجودات فنا کے گھاٹ اتر جائیں گی[1]

---

[1] : پیدائش و مرگ خورشید (ظہور الشمس و موتہا) ص ۱۳۱

یہی شخص دوسری جگہ کہتا ہے: لاکھوں سال پہلے سے یہ انتظار کیا جا رہا ہے کہ سورج کا قطر زہرہ کے مدار سے بڑا ہو جائے اور اس کی روشنی دس لاکھ سے لیکر تیس لاکھ گنا بڑھ جائے اور پھر اس وقت سطح زمین کے تمام سمندر و دریا بڑی شدت سے کھولنے لگیں گے[1]

بعث و نشور کے وقوع کی کیفیت قرآن مجید اس طرح بیان کر رہا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ۔ (س الزمر آیت ۶۸)

اور (جب پہلی بار) صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو لوگ زمین میں ہیں، (موت سے) بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے مگر (البتہ) جس کو خدا چاہے وہ بچ نکلتا ہے پھر (جب) دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کے سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے

گویا صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا، پہلے میں دنیا لپیٹ دی جائے گی اور زمین کے لوگ جو اپنی زندگی میں جنگ و جدال میں مشغول ہوں گے وہ گر پڑیں گے اس پہلے صور میں تمام زمین و آسمان کے باشندوں بلکہ ملائکہ تک کو موت اپنی آغوش میں لے لے گی اور دوسری مرتبہ جب صور پھونکا جائے گا تو اس سے مردے زندہ ہو جائیں گے اور یہیں سے قیامت کی ابتدا ہوگی۔ لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے اور اس وقت ان سے سوالات کئے جائیں گے۔ اور لوگ خوف و ڈر سے تھر تھر کانپ رہے ہوں گے قرآن اس کی منظر کشی کرتا ہے: قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا ۜ هٰذَا (س یٰسین آیت ۵۲) اور (حیران ہو کر) کہیں گے ہائے افسوس! (ہم تو پہلے سو رہے تھے) ہمیں ہماری خوابگاہ سے کس نے اٹھایا؟ —— پھر وہ اپنی آنکھوں کو اچھی طرح کھولیں

---

[1] مادہ زمین و آسمان (مادۃ الارض والسماء) ص ۴۳۳

گے اور کہیں گے هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔
(سورہ یٰسین آیت ۵۲) یہ وہی (قیامت کا) دن ہے جس کا خدا نے (ہم سے) وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے بھی سچ کہا تھا۔

صور اور اس کا پھونکا جانا ایسا ہے جیسے کہ جنگ کی ابتدا کے لئے لشکروں میں بوق بجایا جاتا ہے۔ پہلی مرتبہ آمادگی اور تیاری کے لئے بجایا جاتا ہے اور دوبارہ حملہ کرنے کیلئے بجایا جاتا ہے۔ پس گویا صور واقعاً موجود ہے ایک مرتبہ سب کی موت کے لئے پھونکا جائے گا اور دوسرا عمومی زندگی کے لئے۔

بس جن آیات میں طبیعت کے اندر تغیر و تبدل کا تذکرہ ہے تمام موجودات کے اندر رعب و شور و غل ہوگا۔ زمین، آسمان، چھوٹے، بڑے، انسان، حیوان (بلکہ) تمام مخلوقات مبہوت و حیرت میں ڈوبے ہوں گے۔ اور سب پر خوف طاری ہوگا اور ہر شخص اپنے میں مشغول ہوگا یہ عام لوگوں کی حالت ہوگی۔

لیکن گنہگار، مفسد حضرات کیا کریں گے؟ یہاں سے منکرین کی حالت زار کا بیان ہے کہ اس روز سیاہ دل حضرات زمین پر دوبارہ واپسی کی تمنا کریں گے تاکہ واپس جا کر اپنے اس شرمناک ماضی کی تلافی کر سکیں، جس میں خدا کی نافرمانی کی ہے اور انبیاء کے راستے پر نہیں چلے ہیں۔ اور وہ وعدہ کریں گے اس مرتبہ ہم یقیناً حق سے تمسک کریں گے ـــــــــ

لیکن افسوس! وقت گزر چکا ہوگا پس اس فضاء میں کہ جہاں عظمت الٰہی کا خوفناک سکوت ہر چیز پر چھایا ہوگا ہر فرد انسان سے عصیان و تمرد کی قدرت سلب کر لی جائے گی اور ہر شخص اس آواز کے پیچھے چلے گا جس میں خدا کے حضور حاضری کا حکم دیا گیا ہوگا۔

پروردگار عالم لوگوں کے ضمیروں کو جھنجوڑ رہا ہے تاکہ ان کو اس المناک انجام سے بچائے چنانچہ ایسی گفتگو کرتا ہے جس سے دل لرزاٹھیں، ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (س انفطار آیت ۶)،

اے انسان! تجھے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں کس چیز نے دھوکا دیا ——

اور لوگوں کو خدا ڈراتا ہے کہ: اسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۚ مَا لَكُم مِّن مَّلْجَإٍ يَوْمَئِذٍ وَمَا لَكُم مِّن نَّكِيرٍ (س شوریٰ آیت ۴۷) (لوگو) اس دن کے پہلے جو خدا کی طرف سے آئے گا اور کسی طرح (ٹالے) نہ ٹلے گا، اپنے پروردگار کا حکم مان لو (کیونکہ) اس دن نہ تو تم کو کہیں پناہ کی جگہ ملے گی اور نہ تم سے (گناہ کا) انکار ہی بن پڑے گا ——۔

میدان بعث میں انسان کی آمد

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دوسری دنیا میں زندگی کیسی ہوگی کیا نشور فقط جسمانی ہوگا اور یہی مادی زندگی واپس آجائے گی جو اس مادی جسم کے آثار میں سے ہے۔ یا زندگی والی فقط روح مجرد اور خالص کے چوگھٹے میں پلٹے گی جس کا جسم مادی سے کسی بھی قسم کا تعلق نہ ہوگا اور یہ معلوم ہی ہے کہ روح کو نہ فنا ہے نہ اس پر عدم طاری ہو سکتا ہے۔

اور یا معاد کے دو جنبے ہوں گے ۱۔ روحانی ۲۔ نصف جسمانی۔ نصف جسمانی سے ہمارا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ زندگی کی واپسی ایک لطیف جسم میں ہوگی جو موجودہ مادی جسم کا ایک نچوڑ ہوگا۔ یا پھر ایک تیسرا احتمال بھی ہے کہ چونکہ انسان کی حقیقت جسم و روح سے مرکب ہے لہٰذا دوسری زندگی بھی دو جنبوں پر مشتمل ہوگی بایں معنی کہ نہ مادی بدن ہوگا —— جو کیمیاوی و فزیاوی افعال و انفعال کا مجموعہ ہے —— اور نہ بعث کے وقت اس جسم سے روح الگ ہوگی۔

یہ وہ مختلف راہیں ہیں جو کیفیت بعث کے سلسلے میں دوسری زندگی کے سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں اور اصحاب نظر و مفکرین میں ہر ایک نظریہ کا کوئی موئید بھی ہے۔ اب ہم ہر ایک کی شرح و توضیح کریں گے۔

۱۔ علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد پہلے نظریہ کی حامل اور ان کا کہنا ہے کہ جب موت کا وقت آئے گا اور بدن کے کیمیائی و فیزیائی افعال و انفعال ختم ہو جائیں گے اور اگر چہ جسم اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی۔ لیکن بعث میں بدن کے وہ اجزاء جو مٹی میں اجزاء کے ذروں میں الگ الگ گوشوں میں منتشر و ناپید ہو چکے ہیں۔ وہ سب جمع ہو کر ایک دوسرے سے متصل ہو جائیں گے اور پھر انسان کو دوسری نئی زندگی مل جائے گی اور پھر روح کی واپسی ـــــ روح جو بدن کے ہمار و خواص میں ہے ـــــ حتمی طور سے ناگزیر ہو جائے گی۔

۲۔ زمانہ ماضی کے فلسفیوں نے دوسرے نظریہ کو اختیار کیا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ وجود انسانی کا اساس و منبع چونکہ روح ہے اور اس کی کیفیت تکوین استمرار بقا کی ساعد و معاون ہے اور موت کے وقت اصلی عنصر ـــــ یعنی روح ـــــ اپنے مادی جسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیتا ہے۔ اور جسم کا وہ دور "جو ایک مختصر مدت تک کے لئے مستمر تھا اور جسم نے اپنی قدر و قیمت روح کے زیر سایہ حاصل کی تھی" ختم ہو جاتا ہے کیونکہ جسم میں صرف اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ فقط ایک محدود مدت کے لئے اس اصلی عنصر کی حفاظت کر سکے۔ اور اس کے بعد وہ عوامل مادیہ کے تحت تاثیر ختم و زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ لیکن روح ـــــ جو ایک مجرد و غیر فانی ہے ـــــ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ اس لئے میدان بعث میں صرف روح ہی داخل ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی اور معاد کا کوئی مفہوم و معنی ہی نہیں ہے۔ اس بناء پر تمام ثواب و عقاب صرف روحانی ہوگا۔ اور اس دوسرے نظریہ کے قائلین اوّلاً تو زمانہ ماضی میں تھے اور آج اس کا کوئی قائل نہیں ہے اور

ثانیاً یہ کہ اس نظریہ کے صحت پر کوئی مسلم دلیل بھی موجود نہیں ہے۔ اور ثالثاً یہ کہ محققین علماء کی طرف سے اصلی اور واقعی نظریہ کے انتشار کی وجہ سے اس میں بہت سے نقاط ضعف بھی معلوم کر لئے گئے ہیں۔

۳۔ تیسرے نظریہ کے قائل بعض قدیم فلسفی حضرات ہیں جن کا عقیدہ یہ تھا کہ جب ہم موت کے قبضہ میں چلے جاتے ہیں تو واقعی طور پر ہمارے اجسام فنا اور زائل ہو جاتے ہیں اور پھر نہ تو اس مادی بدن کے اجزاء واپس آتے ہیں اور نہ منتشر شدہ عناصر ہی پلٹتے ہیں۔ البتہ روح باقی رہتی ہے۔ لیکن وہ بھی خالص تجرد کی حالت میں نہیں رہتی بلکہ ایک لطیف جسم میں حلول کئے ہوتی ہے ـــــ یہ بات درست ہے کہ اس میں فعل و انفعال کیمیاوی و فزیائی کی قابلیت نہیں رہتی لیکن بعض جہات سے اس جسم سے مشابہ ہوتا ہے اور اس کو (جسم مثالی) کہا جاتا ہے اور یہ جسم ـــــ جسم مثالی ـــــ بہت ہی فعال ہوتا ہے اس میں موانع کو ختم کر دینے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کی بھی صلاحیت ہوتی ہے کہ ایک قالب موجود و ثابت و ابدی کے اندر اپنی ابدی زندگی کو قائم رکھے۔

۴۔ چوتھی رائے بہت سے فلاسفہ و متکلمین کی ہے ان میں سے کچھ تو زمانہ ماضی میں تھے اور کچھ اس وقت بھی زندہ موجود ہیں۔

اس نظریہ کا دار و مدار اس کلیہ پر ہے کہ معاد مکمل واپسی کا نام ہے۔ کیونکہ انسان سے جو چیز بھی متعلق ہے اسے فنا نہیں ہے اور وہ دوسری دنیا میں اپنے تمام ابعاد اور سارے خصوصیات کے ساتھ نئے سرے سے زندگی بسر کریگی۔ لیکن وہ زندگی بہت ہی ارفع اعلیٰ شکل میں ہوگی۔ اور اس مرحلہ میں پہنچ کر اس کی حالت یہ ہو جائے گی کہ روح و مادہ ایک موجود واحد کی شکل میں ہوں گے حالانکہ درحقیقت دونوں مختلف ماہیت ہیں۔ اور یہ اتحاد اس قریبی واسطہ کی وجہ سے ہے جو دونوں کو مرتبط کئے ہوئے ہے

پس گویا دوسری زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں جنبوں پر مشتمل ہے جس طرح دنیاوی زندگی میں دو جنبوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ حیات بعد الموت کی کیفیت پر ہم کوئی عقلی دلیل نہیں قائم کر سکتے لیکن جو چیز بحث کے لائق اور تحقیق عقلی و فلسفی کے قابل ہے وہ "اصل معاد و بعث کی ضرورت ہے" لیکن یہ کہ ممکن صورتوں میں کون سی صورت حتمی الوقوع ہے۔ عقل و فلسفہ اس کو نہیں حل کر سکتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آخری رائے سے سچائی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ یہ نظریہ اسلامی نصوص صریحہ سے مشتق ہے۔

قرآن کریم ــــــــ جو اسلامی مسائل کا سب سے اہم مدرک ہے ــــــــ نے متعدد جگہ معاد کے جسمانی ہونے کا ذکر کیا ہے اور صریحی طور پر اعلان کیا ہے کہ انسان قیامت میں اسی دنیاوی جسم کے ساتھ محشور ہوگا۔ اور اس قسم کی آیات اتنی واضح ہیں کہ جن میں کسی قسم کی تاویل بھی ممکن نہیں ہے۔۔ لیجئے ان آیات کو ملاحظہ فرمائیے، اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (س روم۔ آیت ۱۱) خدا ہی نے مخلوقات کو پہلی بار پیدا کیا پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا پھر تم سب لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ــــــــ

دوسری جگہ ارشاد ہے: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ (س قیامت، آیت ۳،۴) کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم انکی ہڈیوں کو (بوسیدہ ہونے کے بعد) جمع نہ کریں گے۔ ہاں ہم ضرور کریں گے۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کا پور پور درست کریں۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر صریحی دلالت کرتی ہے کہ جن لوگوں کا خیال ہے کہ بدن کے اجزاء فنا اور منتشر ہو جانے کے بعد ان میں دوبارہ زندگی کی صلاحیت نہیں ہے۔ وہ لوگ خدا کی غیر متناہی قدرت کی معرفت ہی نہیں رکھتے اور وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ انسان کو دوبارہ انہی ذرات کے ساتھ پیدا کرنا بلکہ ان باریک خطوط کی جو پوروں میں پھیلے ہیں

ہیں اسی طرح دوبارہ بنانا خدا کی غیر محدود قدرت کے مقابلے میں ایک امر بسیط ہے۔

تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ (سورہ یٰسین، آیت ۷۸، ۷۹) اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی خلقت (کی حالت) بھول گیا (اور) کہنے لگا کہ بھلا جب یہ ہڈیاں (سڑ گل کر) خاک ہو جائیں گی تو (پھر) کون (دوبارہ) زندہ کر سکتا ہے۔ (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اس کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو (جب یہ کچھ نہ تھے) پہلی مرتبہ زندہ کر دکھایا وہ ہر طرح کی پیدائش سے واقف ہے۔

قرآن مجید نے جناب عزیرؑ کا قصہ بیان کیا ہے اور جناب ابراہیمؑ کا قصہ بھی تفصیل سے بیان کیا ہے اور یہ دونوں قصے معاد جسمانی کے زندہ نمونے ہیں اور خدا نے ان دونوں نبیوں کا مسئلہ عینی صورت سے واضح کر دیا ہے اور ان دونوں نے اپنی آنکھوں سے بعث و نشور کا نمونہ دیکھا ہے اور ان کو یہ بھی دکھا دیا کہ متفرق اجزا کے بدن میں روح نئے سرے سے کیونکر داخل ہوتی ہے۔ لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب حالات سازگار ہو جائیں تو خدا کے حکم سے دوبارہ نئی زندگی دی جاتی ہے۔

جناب عزیرؑ کا قصہ یہ ہے کہ ایک دن اپنی سواری پر جا رہے تھے تو ایک ایسی جگہ سے آپ کا گزر ہوا جہاں ایک خرابہ میں بہت سے لوگوں کی بوسیدہ ہڈیاں پڑی تھیں اور جن کو مرے ہوئے ایک طویل زمانہ گزر گیا تھا یہ دیکھ کر جناب عزیرؑ بہت دیر تک سوچتے رہے اور سوال کیا ان بوسیدہ اجسام کو خدا کیونکر زندہ کرے گا؟ اتنا کہنا تھا کہ خدا نے ان کی بھی روح قبض کر لی اور سو سال کے بعد دوبارہ ان کو نئی زندگی بخشی اور سوال کیا عزیرؑ تم کتنے دن یہاں رہے؟ انہوں نے کہا ایک دن یا اس کا کچھ حصہ! تو ان سے کہا گیا تم یہاں پر سو سال مردہ پڑے رہے اور ذرا اپنے گدھے کو دیکھو جس کے اجزاء منتشر ہو چکے ہیں

ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں؟ اور اپنی غیر محدود قدرت دکھانے کے لئے
خدا نے عزیرؑ کے پانی اور کھانے کو ویسے ہی محفوظ رکھا جیسا کہ تھا اس میں کسی قسم کا تغیر
نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ پانی اور غذا فطری عوامل مثلاً روشنی، گرمی، غبار وغیرہ کی وجہ سے بہت
جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ لیکن عزیرؑ کا کھانا پانی مکمل ایک قرن گزرنے کے بعد بھی
جیسے کا تیسا رہا۔ لیجئے پورا قصہ پڑھیئے۔

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۗ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (س بقرہ آیت ۲۵۹)

(اے رسول تم نے) مثلاً اس (بندہ) کے حال پر بھی نظر کی جو ایک گاؤں پر (سے ہوکر)
گزرا اور وہ ایسا اجڑا تھا کہ اپنی چھتوں پر ڈھے کے گر پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ بندہ (کہنے لگا) اللہ!
اب اس گاؤں کو (ایسی) ویرانی کے بعد کیونکر آباد کرے گا؟ اس پر خدا نے اسکو
(مار ڈالا اور) سو برس تک مردہ رکھا۔ پھر اسے جلا اٹھایا (تب) پوچھا تم کتنی دیر پڑے رہے
عرض کی ایک دن پڑا رہا یا ایک دن سے بھی کم! فرمایا! نہیں تم (اسی حالت میں) سو برس
پڑے رہے۔ اب ذرا اپنے کھانے پینے (کی چیزوں) کو دیکھو ابھی تک نہیں اور
ذرا اپنے گدھے (سواری) کو تو دیکھو (کہ اس کی ہڈیاں ڈھیر پڑی ہیں اور سب اس واسطے
کیا ہے) تاکہ لوگوں کے لئے تمہیں قدرت کا نمونہ بنائیں اور (اچھا اب اس گدھے کی)

ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ ہم کیونکر ان کو جوڑ جاڑ کر ڈھانچہ بناتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب ان پر یہ ظاہر ہوا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ (اب) میں یہ یقین کامل جانتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی دوسری متعدد آیات ہیں جو صراحتاً معاد کی کیفیت کو بیان کرتی ہیں اور صرف معاد روحانی کی نفی کرتی ہیں مثلاً ارشاد خداوندی ہے: وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِى الْقُبُوْرِ[1]۔ اور قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں اور بے شک جو لوگ قبروں میں ہیں انہیں خدا دوبارہ زندہ کریگا دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (س اعراف آیت ۲۹) اور اس کے لیے نری کھری عبادت کرکے اس سے دعا مانگو جس طرح اس نے تمہیں شروع (شروع) میں پیدا کیا تھا اسی طرح پر (دوبارہ) زندہ کیے جاؤ گے۔

یہ آیت کریمہ ایک مختصر اور بلیغ جملہ سے انسان کی ابتدائے خلقت کی طرف ملتفت کر رہی ہے کہ کس طرح جامد زمین اور پانی سے بنائے جسم کو مرکب فرمایا حالانکہ یہ عناصر (زمین و پانی) کسی وقت غذائی مواد کی صورت میں تھے۔ زمین کے مختلف حصوں میں میوہ جات اور ترکاریوں کی صورت میں منتشر تھے اور پانی کے قطرہ کی صورت میں سمندروں میں گم ہو چکے تھے کیونکہ بخار بن کر بادل کی صورت میں آئے پھر بارش کی صورت میں زمین پر برسے۔

پھر آخر انسان اس بات کی تصدیق کیوں نہیں کرتا کہ یہ منتشر مواد جنکو ہوا اور پانی نے زمین کے مختلف اطراف میں پھیلا دیا تھا دوبارہ اکٹھا ہو کر اپنی پہلی شکل میں آسکتے ہیں۔؟

---

[1]: سورہ حج آیت ۷۔

تجدید . . . . . . اور اگر تجدید حیات ایک غیر ممکن چیز ہے تو ابتدائے خلقت میں اس کا تحقق کیونکر ہوا ؟

قرآن مجید ایک اور موضوع پیش کر رہا ہے جو معاد جسمانی سے متعلق ہے چنانچہ ارشاد ہے : وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (سورہ فصلت السجدہ) آیہ ۱۹ تا ۲۱ (نوٹ : اس سورۃ کو حم السجدہ بھی کہا جاتا ہے مترجم) ، اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہنکائے جائیں گے تو یہ لوگ ترتیب وار کھڑے کئے جائیں گے یہاں تک کہ جب سب کے سب جہنم کے پاس جائیں گے تو اُن کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے گوشت پوست ان کے خلاف ان کے مقابلے میں ان کی کارستانیوں کی گواہی دیں گے اور یہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی تو وہ جواب دیں گے کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اس نے ہمیں بھی (اپنی قدرت سے) گویا کیا اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور (آخر) اسی کی طرف تم لوگ لوٹائے جاؤ گے ۔

یہ بہت ہی تحیر انگیز اور رعب دار موقف ہوگا اور موقف میں کسی کو یہ تصور بھی نہ ہوگا کہ اس کے بدن کے اجزاء اس کے خلاف گواہی دیں گے ایسے موقع پر گواہی کے لئے خدا نے جسد کو منتخب کیا جو تمام چیزوں سے زیادہ بدن سے ملی ہوئی ہے ۔

جن لوگوں کی قوتِ فکر کم ہے اور وہ یہ نہیں جانتے کہ مخلوق کے تمام افعال کا علم پروردگار عالم کو ہے وہ گناہوں اور فساد کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنے عیوب کو لوگوں کی

نظروں سے چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن قیامت کے دن ان کی سماعت ان کی بصارت ان کے جلد سب خلاف ہو جائیں گے۔ اور یہی چیزیں منبع علم ہوں گی، یہی چیزیں سامنے آکر ان کے خلاف گواہی دیں گی۔ لہٰذا انسان مبہوت ہو کر اپنے اعضاء سے کہے گا کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو جواب میں اعضاء کہیں گے جس خدا نے سب کو قوت نطق دیا ہے اسی نے ہمیں بولنے پر آمادہ کیا ہے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں، جب (سلسلۂ) امور ٹوٹ جائے گا، زمانے گزر جائیں گے یوم نشور قریب آ جائے گا تو خدا لوگوں کو قبروں سے، پرندوں کو گھونسلوں سے، درندوں کو بھٹوں سے، ہلاکت گاہوں سے اس طرح نکالے گا کہ اس کے حکم کی طرف دوڑ رہے ہوں گے، باجماعت، صف در صف کھڑے ہو کر خاموشی کے ساتھ اس کے معاد کی طرف چل رہے ہوں گے، ذلت کے لباس جسم پر ہوں گے اور سرنگوں ہوں گے، حیلے بیکار ہو چکے ہوں گے، امیدیں منقطع ہو چکی ہوں گی، دل دھڑک رہے ہوں گے، آوازیں دب رہی ہوں گی۔[1]

بعض آیات میں ہے کہ بعث میں بدن دنیاوی بدن جیسا ہوگا مثلاً ارشاد ہے:

كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ

(سورۃ النساء آیت ۵۶) (اور) جب ان کی کھالیں (جل کر) گل جائیں گی تو ہم ان کے لئے دوسری کھالیں بدل کر پیدا کر دیں گے تاکہ وہ اچھی طرح عذاب کا مزہ چکھیں ——— یہاں پر ایک ڈراؤنا منظر پیش کیا گیا ہے کہ حسی طور پر عذاب مجسم ہوگا اور یہ عذاب مفسدین کے لئے مکرر ہوتا ہی رہے گا۔

---

[1] نہج البلاغہ از ڈاکٹر صبحی صالح ص ۱۰۸، ۱۰۹

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ آیات پہلی آیات سے متصادم نہیں ہیں کیونکہ نئی کھال اسی کی ذات سے بنائی جائے گی چاہے اس میں کمی ہو یا زیادتی اس کے وجود میں کوئی تغیر نہ ہوگا لیکن بہتر ہے کہ عدم تصادم کی تفسیر امام جعفر صادقؑ سے سنیں۔

حفص بن غیاث کہتے ہیں (ایک مرتبہ) میں مسجد الحرام (ایسے وقت) پہنچا کہ ابن ابی العوجا امام صادقؑ سے "کلما نضجت جلودھم" الخ کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ اس غیر" کا کیا گناہ ہے کہ جلی ہوئی کھال کی جگہ اس کو کر دیا جائے گا؟ امام نے فرمایا: تجھ پر وائے ہو یہ کھال وہی ہے اور غیر بھی ہے۔ اس نے کہا دنیاوی چیزوں سے مثال دیجئے، سرکار نے فرمایا اگر کوئی آدمی اینٹ اٹھا کر توڑ ڈالے پھر سانچے میں ڈال کر اس کو اینٹ بنالے تو یہ وہی پہلی والی بھی ہے اور دوسری بھی ہے؛

رسول اکرمؐ جب معاد جسمانی کا تذکرہ فرماتے تھے تو آپ کی گفتگو مشرکین کو عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی نہ تو یہ لوگ سمجھ پاتے تھے اور نہ قبول کرتے تھے اور اسی لئے وہ لوگ بے وقوفی کی باتوں سے آپ کا مقابلہ کرتے تھے۔

قرآن بھی چاہتا تھا کہ اس فضا کو جو بیمار افکار سے پُر ہے جس میں ظلم و اوہام پرستی کا پھیلاؤ ہے، نامعقول عقائد کی بھرمار ہے اور جس میں دن بدن انحطاط ہے اسے ایک ایسی فضا سے بدل دے جو آزاد فکر کی مالک ہو اور حقیقت کی طلبگار ہو اسی لئے یہ قرآن کی باتوں کا ذکر کرتا ہے، وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ يُنَبِّئُكُمْ إِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّكُمْ لَفِي خَلْقٍ جَدِيدٍ أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَم بِهِ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلَالِ الْبَعِيدِ (س سبا، آیت ۷، ۸)

اور کفار (مسخرے پن سے باہم) کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہیں ایسا آدمی (محمدؐ) بتا دیں جو تم سے

بیان کرے گا کہ جب تم (مر کر مٹی میں) گل جاؤ گے اور بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تم یقیناً ایک نئے جسم میں آؤ گے۔ کیا اس شخص (محمدؐ) نے خدا پر جھوٹ طوفان باندھا ہے یا اسے جنون (ہو گیا) ہے (نہ محمدؐ جھوٹے ہیں نہ انہیں جنون ہے) بلکہ خود وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے عذاب اور پرلے درجہ کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہ آیات وضاحت کے ساتھ معاد جسمانی کو بیان کر رہی ہیں اور اس کے خلاف ان کی تاویل غیر ممکن ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم موضوع کو ایک دوسرے زاویہ سے دیکھیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جسم و روح دو مرتبط حقیقت ہیں اور ان میں دونوں کا ارتباط وجود انسانی کی تکوین تک پہنچاتا ہے اور میدان وجود میں جو حرکت یا ارادے متحقق ہوتے ہیں وہ ان دونوں کا ثمرہ ہے۔

اور اس نظریہ کے پیش نظر نہ صرف یہ کہ ہم کو جسم و روح کے انفصال کو ماننا پڑتا ہے بلکہ واقعی انسان کے وجہۃ نظر سے جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ اخلاقی زندگی کی تجدید کے لئے ان دونوں ــــــ جسم و روح ــــــ میں ترکیب کی ضرورت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اور ہم جانتے ہیں کہ روح و جسم ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ جسم افعال روح کا وسیلہ ہے اور جسم کی اہمیت اور اساسی عنصر ہونے کی وجہ سے یہ روح کے افعال میں استقرار کے لئے کافی مؤثر ہے۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ اعتراض آتا ہے کہ تاریخ بشر میں جتنے لوگ مر چکے ہیں ان سب کے لئے قیامت کے دن "جمع کرنے کے لئے یہ کرۂ ارض ناکافی ہے ابتدائے خلقت سے نفخ صور تک جتنے بھی انسان مرے ہیں اس چھوٹے سے خطہ میں کیسے سما جائیں گے؟ مگر یہ اعتراض بے بنیاد ہے کیونکہ قرآن مجید یہ خبر دے رہا

ہے کہ اس کائنات کی عمر ختم ہوتے وقت یہ دائرہ کی شکل میں حرکت کرنے والے افلاک بڑے بڑے پہاڑ و ذرات میں تبدیل ہو کر ادھر ادھر ختم ہو جائیں گے، سورج و چاند کی روشنیاں بجھ جائیں گی اور معمولی ذرات سے لے کر بڑے بڑے امور جو تمام اطراف عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان سب کا نظم و ضبط ختم ہو جائیگا۔ اس کے بعد انہیں ذرات و خرابات و حطام پر ایک وجود کا نیا نظام قائم کیا جائے گا (اس وقت کائنات کا تصور بھی نہ ہو سکے گا) اب سوچیئے یہ کتنی بے تکی بات ہے کہ اس کرۂ ارض پر جگہ ہی نہ رہے گی اور یہ تنگ ہو جائے گا۔

اسی طرح الٰہی مسلک کے مخالف جن کی عادت ہی اعتراض کی ہے ان حضرات نے بھی اس طرح اعتراض کیا ہے کہ ہر انسان کے جسم کے خلیے چند سالوں میں ایک مرتبہ مزید بدل جایا کرتے ہیں۔ اسی لئے ہر انسان کا پوری عمر میں قالب تدریجی طور پر اور غیر محسوس طریقے سے چند مرتبہ بدل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ زندگی میں جب قالب نے اعمال کئے ہیں ہر ایک جزا کا صرف وہی قالب مستحق ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پوری زندگی میں کس قالب پر قیامت کے دن عذاب کیا جائے گا؟

لیکن اس اعتراض کا جواب بھی واضح ہے کیونکہ جب جدید خلیے تمام خصوصیات و مشخصات میں قدیم خلیوں کے وارث ہوتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ موجودہ بدن کی ظاہری شکل کو سابق بدن کے مشخص و ممیز کرنا ممکن ہے تو جب ایسا ہے تو آخری جسم جو سابق تمام اجسام کے خصائص کا نچوڑ ہوگا تو پھر آخری جسم کی بعثت ــــ یعنی وہ جسم جس پر انسان کا خاتمہ ہوا ہے اور وہ موت کے گھاٹ اترا ہے ــــ گویا تمام اجسام سابقہ کی بعثت ہوگی کیونکہ یہی سب کا قائم مقام اور خلیفہ ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا اعتراض کرتے ہیں کہ یہ تراب جو زمین میں وافر مقدار میں

ہے یہ انسانی جسم کے بنیادی مواد کے بنانے کے لیئے ناکافی ہے۔ کیونکہ لوگوں
کی تعداد ابتدائے خلقت سے لے کر آخر تک بہت زیادہ ہے اور زمین کم ہے ـــــــ
لیکن جب ہم حساب کرنے بیٹھیں گے اور وقت نظر سے کام لیں گے تو اس استنباط
کی غلطی معلوم ہو جائے گی کیونکہ یہ اعتراض مبنی بر تحقیق نہیں ہے یاد رکھئے
ایک کلو میٹر مکعب تراب ایک لاکھ ملین انسان کے بنانے کے لیئے کافی ہے، یعنی کرۂ ارض
کے مقابلے میں یہ تھوڑی سی مقدار موجودہ باشندگان زمین کے بیس گنا لوگوں کی تخلیق کے
لیئے کافی ہے۔ لہٰذا ہزاروں ہزار ملائین انسانی جسم کی تخلیق کے لیئے زمین کا ایک چھوٹا سا
ٹکڑا کافی ہے اور تراب ارض کی یہ معمولی سی مقدار ابنائے بشر کے اعادۂ ابلکے مواد جسیہ
کے لیئے بہت کافی ہے۔ اسی بات سے پتہ چل جاتا ہے کہ جسم انسانی کی نئی تخلیق کیلئے
بنیادی مواد میں کمی کا مسئلہ بحث کے قابل ہی نہیں ہے۔

ایک اور بڑا اعتراض معادِ جسمانی پر کیا جاتا ہے جو نظروں کو متوجہ کر لیتا ہے اور جس
چشم پوشی یا اس کا بھلا دینا ممکن نہیں ہے۔ اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اجسام
کے اجزاء مخلوط ہوتے رہتے ہیں، سابق بدنوں کے اجزاء غذا کے ذریعے یا تحول کے
ذریعے مٹی بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد غذائی مواد میں منتقل ہو جاتے ہیں اور
وہی موادِ غذائیہ بعد میں آنے والی نسلوں کے بدن کا جزو بن جاتے ہیں اور یہ طے شدہ
بات ہے کہ کوئی بھی انسانی جسم دوسرے عناصر کے اختلاط سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔
اور مواد کی اسی ترکیب اور مکمل امتزاج کو اس دنیا کے اندر کمیت و کیفیت کے لحاظ سے
ایک دوسرے سے متمیز نہیں کیا جا سکتا اور قیامت میں اگر نئی زندگی مان لی جائے
تو اجزائے معینہ کے اندر باقاعدہ نزاع و جنگ پیدا ہو جائے گی اور یہ ضروری نہیں ہے کہ
یہ جھگڑا صرف دو ہی شخصوں میں ہو بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک جزو کے بارے میں

بہت سے لوگ مرگئے ہوں اور ہر شخص کہتا ہو کہ اس جزو کا مالک میں ہوں تو پھر اس وقت اس جزو کا مالک کون ہوگا ؟

لیکن جب ہم اپنی پہلی زندگی کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا وجود پہلے صرف ایک خلیے سے شروع ہوا اس کے بعد ہمارے اعضاء کی تدریجی نمو اور اس ایک خلیہ کی کثرت سے ہمارا جسم بنا ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری شخصیت اور ہمارے جسم کے تمام خصوصیات ہمارے خلیوں کے ہر خلیہ میں بھرپور طریقہ سے موجود ہیں ——— بخلاف سابق حضرات کے ان کا نظریہ یہ تھا کہ تمام جسمانی خصوصیات صرف ان جنسی خلیوں میں ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے مشابہ ہیں ——— اور ہر خلیہ تنہا ہی انسانی شخصیت کی عکاسی کرسکتا ہے اور یہ قانون ——— ہمارے جسم کے تمام خصوصیات ہمارے ہر خلیہ میں موجود نہیں اور ہر خلیہ انسانی شخصیت کی عکاسی کرسکتا ہے ——— صرف انسان ہی پر منطبق نہیں ہے بلکہ ہر زندہ موجود میں یہی قاعدہ موجود ہے ۔

اور جب یہ طے ہے کہ جسم کا ہر خلیہ انسان کی شخصیت کی عکاسی کرسکتا ہے تو پھر مناسب حالات میں صرف ایک خلیہ میں یہ صلاحیت ہوسکتی ہے کہ بطور انقسام اور جدید خلیوں کی تکوین سے ہمارے ہر لحاظ سے ایک جدید جسم تخلیق کرسکتا ہے ۔

اب اگر ایک جسم کے اجزاء کسی دوسرے جسم میں جاکر دوسرے جسم کے اجزاء بن جائیں تو اس شخص سے متعلق اجزاء مستقبل میں کسی وقت اپنی اصلی جگہ پر آجائیں گے اور جب وہ اجزاء اپنی اصلی جگہ پر واپس آجائیں گے تو دوسرا جسم بھی اپنے اصلی وجود کی حفاظت کرسکے گا ۔

ہم یہاں پر یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب دونوں جسموں کے اجزاء ممیز و محفوظ ہوں تو دونوں کے عناصر میں چاہے جتنا اختلاط ہو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور ہر بدن کے

باقی اجزاء ــــــــ چاہے وہ بہت ہی ضعیف ہوں اور صرف ایک خلیہ کے برابر ہوں ــــــــ کی نمو کی صلاحیت اور دوبارہ زندگی ہونے کی استعداد باقی رہتی ہے اور کوئی بھی عامل اس تجدید میں حائل نہیں ہو سکتا۔

بہر حال ترمیم کی قابلیت و استعداد ــــــــ چاہے وہ جلدی تمام ہونے والی ہو، یا دیر میں ــــــــ ایک ایسی تمیز دینے والی شئے ہے جو ہر جزو میں محفوظ رہتی ہے اور یہ اکتساب حیات کے بعد نطفۂ اولیٰ کی طرح ــــــــ جسم میں دوسری زندگی کا اعادہ کر سکتی ہے

اس اعتراض کو دوسرے طریقہ سے بھی حل کیا جا سکتا ہے وہ اس طرح کہ انسانی جسم کی خاصیت میں تحلیل و ابدال ہے۔ اور اسی لئے ہر چند سال کے اندر تدریجی طور پر پورا جسم بدل جاتا ہے۔ پس اگر کسی انسان کی کوئی شئے منتقل ہو کر ــــــــ ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ ــــــــ کسی دوسرے جسم انسان میں غذا کے ذریعے حلول کر جائے تو ظاہر ہے کہ اس غریب جسم کا ایک ہی حصہ اُس انسان کامل میں مخلوط ہوگا جس کے یہاں بطور غذا انتقال ہوا ہے۔ کل کا کل تو مخلوط نہ ہوگا کیونکہ غذا کھانے والے انسان کا جسم مجموعی غذا سے صرف ۱/۱۰۰ حصہ اپنے میں جذب کر سکتا ہے۔ جب ایسا ہے تو آخر جسم کا بقیہ حصہ جو تقریباً ننانوے فیصد سے زیادہ ہے اسے کیوں مبعوث نہیں کیا جا سکتا ؟

ان تمام امور سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی فیزیائی قوانین کے پیش نظر کائنات کی ہر طاقت معین حالات میں دُوسری طاقت سے بدل سکتی ہے۔ اب اگر ہم انسان کو بھی ایک طاقت کا منبع مان لیں جیسا کہ مرنے کے بعد بھی وہ ایک طاقت کا منبع رہتا ہے تو اس کا جسم متغیر ہو کر طاقت کی ایک شکل سے دوسری شکل میں منتقل ہو سکتا ہے اور قیامت میں تمام طاقتیں آزاد ہو کر پائی جائیں گی تو ان سب میں اپنی پہلی شکل کی طرف پلٹ جانے کی صلاحیت بھی ہوگی اور یہ منعکس فعل و انفعال کے ذریعے اپنی پہلی

شکل میں آجائیں گی اور حیات بعد الموت کا یہی مطلب ہے۔ اب رہی یہ بات کہ یہ تغیر کیونکر ہوگا؟ تو اگر ہمیں اس کی کیفیت معلوم نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مسئلہ قابل حل ہی نہیں ہے اور صرف ہمارے عدم علم کی وجہ سے محال کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہا مسئلۂ عذاب تو اس سلسلہ میں یہ بات معلوم ہے کہ جو چیز سبب عذاب و الم ہوتی ہے اس کا روح سے علاقہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی مومن انسان کے جسم کا جزو کسی کافر کے جسم میں منتقل ہو جائے تو پھر عذاب اسی کافر پر کیا جائے گا، مومن پر عذاب نہیں کیا جائے گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ بات اعتراض سے بالاتر ہے کہ اجسام سابقہ جو موت کے وقت تک تدریجی طور پر متعدد مرتبہ اپنی شکلوں کو بدل لیتے ہیں انہیں خدا دوبارہ زندگی عطا کرکے معاد میں قائم کر دے کیونکہ دماغی خلیوں اور قدیم عصبی و عظیم خلیوں کی جگہ پر نئے خلیے اور مواد جدیدہ کو پیدا کر دے، کیونکہ یہ تو واضح سی بات ہے کہ آج کا انسان وہی دن پہلے والا انسان نہیں ہے۔ اور روح جب بھی کسی سابق بدن سے متعلق ہو جائے تو کافی ہے، کیونکہ جس چیز پر انسان کی انسانیت موقوف ہے اور وہ امتداد زمانہ سے تغیر پذیر نہیں ہوتی اور جو چیز وحدتِ شخصی کو اس طرح محفوظ رکھتی ہے کہ ایک انسان کے ممیزات دوسرے انسان میں مخلوط نہ ہونے پائیں وہ چیز صرف روح مجرد ہے جس کے پیدائش سے لے کر موت تک جسم کی تدبیر اور اس کا ادارہ کرتا ہے ــــــــــــ

اور اگر ہم کروڑوں انسانوں کو ابتدائے خلقت سے لے کر اس وقت تک جمع کریں تو کسی بھی شخص کے روحی مشخصات دوسرے پر منطبق نہیں ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی شخص دس سال پہلے کوئی جرم کرے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اب اسے سزا نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ وہ شخص نہیں رہ گیا ہے جو دس سال پہلے تھا۔

اگر ہم کسی کتاب کو آفسٹ کے ذریعے دوبارہ چھاپیں تو مضمون کے لحاظ سے دوسرا ایڈیشن عین پہلا ایڈیشن ہے اگرچہ اس کتاب کی جلد اور اوراق بدل گئے ہیں مگر پھر بھی یہ وہی پہلی کتاب ہوگی۔ اور روح کا مبعوث کرنا بالکل اسی طرح کا ہے یعنی اصل روح باقی رہتی ہے، فنا نہیں ہوتی ——

اور جس طرح انسان کسی وسیلہ یا مادہ کا محتاج ہوتا ہے جس سے اپنے افعال کا اظہار کرسکے اسی طرح روح کا دنیاوی جسم کے ساتھ محشور کرنا ضروری کا ہے تاکہ اس وسیلہ کے ذریعہ ثواب یا عتاب دیا جاسکے —— لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بعث میں ہر شخص کو ان تمام تغیرات کے ساتھ محشور کیا جائے جو اس پر پیدائش سے موت تک طاری ہوئے ہیں کیونکہ ایسا کرنے پر انسانی جسم بہت خوفناک اور ڈراؤنا ہو جائے گا۔

ہمارے بیان سے یہ اعتراض —— کہ اگر ایک فرد کے اجزاء دوسرے شخص میں منتقل ہو گئے تو پھر ایک ہی چیز کا ایک ہی زمانہ میں دو مختلف شخصوں کے ضمن میں محشور ہونا ضروری ہو جائے گا —— بھی بالکلیہ دور ہو گیا۔

آخر کلام میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تمام وجوہ اور احتمالات جو ذکر کئے گئے لوگوں کی دوسری زندگی کی کیفیت کے سلسلے میں یقینی اسباب نہیں ہیں بلکہ جتنی بھی چیزیں ذکر کی گئیں۔ یہ صرف وہ راستے ہیں جہاں تک ہمارے علم کی رسائی ہو سکی ہے، لہٰذا وہ افکار و نظریات جو بعثِ اموات کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں ان کا اسی ذکر یا صورت میں محدود و منحصر کر دینا صحیح نہیں ہے اور اس پوری بحث سے ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہمارے معادِ جسمانی کے عقیدہ کی بنیادیں ان شبہات و اعتراضات سے متاثر نہ ہو سکیں اور معادِ جسمانی کا عقیدہ ایسا ہے کہ جس پر تمام ادیانِ الٰہیہ متحد و متفق ہیں اور بالخصوص قرآن مجید جو اسلامی عقائد کا ارگن ہے ——۔

منزلِ موعود کے ممیزات

انسانوں، شہروں، باغات کی جو تصویریں سنتے وقت ہمارے ذہن میں آتی ہیں وہ جب ہم
قریب سے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو بالکل مختلف نظر آتی ہیں۔
اور اس کا تعلق بعض ان چیزوں سے ہے جنہیں انسان اپنی زندگی میں متعدد مرتبہ محسوس کرتا ہے
لیکن آخرت کی سعادت اور اس کی نعمتوں، عذاب بعث اور اس کے آلام کا ہم تصور
بھی نہیں کر سکتے اور دنیاوی لغت میں ابھی تک ایسے الفاظ بھی ایجاد نہیں ہو سکے ہیں
جو اس مفہوم کو ادا کر سکیں اور ہمارے ذہنی تصورات کسی بھی لحاظ سے ان مفاہیم واقعیہ پر منطبق
ہی نہیں ہوتے۔

اور حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ گنہگاروں پر کئے جانے والے عذاب و آلام
اور آخرت کی بیشمار نعمات کا ادراک اس انسان کے لئے جس نے ان چیزوں کو اپنی
زندگی میں دیکھا ہی نہ ہو اور محسوس ہی نہ کیا ہو آسان بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہمارے
امور غیبی ہیں اور ہمارے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کے تجربہ پر بھی قادر نہیں ہیں
اسی لئے ہمارے عقول ان کے حقیقی مفاہیم کے ادراک سے عاجز ہیں اور ان ظاہری اشیاء
کی تصویروں کا انطباق ان حقائق پر جو ہماری دسترس سے باہر اور ہمارے تجربہ میں نہیں
آئے ہیں، ناممکن ہے۔

تمام وہ الفاظ اور جملے جنکو ہم اپنی ثقافت میں پاتے ہیں وہ صرف اس دنیا کے
محدود وسائل کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ ہمارے تجربات کی قاموس میں ان کلمات
کے علاوہ دوسرے کلمات کا وجود ہی نہیں ہے۔ اسی لئے یہ الفاظ ان حقائق کی

وضاحت کرنے سے عاجز ہیں جو اس دنیا سے ماوراء ہیں ۔

اس لئے ہمارے پاس جب تک دوسرے کلمات نہ ہوں گے ہم ان امور کی معرفت سے عاجز رہیں گے جو اس دنیا کے حدود سے خارج ہیں ـــــــ یہ صحیح ہے کہ دنیاوی اور آخرت کی زندگی میں کچھ مشترک وجوہ ہیں جو واقعی ہیں اور جن پر لذت و الم، فرح و سرور طاری ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود دونوں میں بہت وسیع اختلاف ہے اور دونوں میں بڑے گہرے فاصلے موجود ہیں ۔ مثلاً اس دنیا میں عمر کی ابتداء بچپنے سے ہوتی ہے اور بڑھاپے پر خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں ایسے تغیر و تحول کا کوئی اثر بھی نہیں ہے اسی طرح اس دنیا میں صرف عمل اور بیج بونے کی علمداری ہے ۔ لیکن آخرت پھلوں کے جمع اور حاصل کے اکٹھا کرنے کے علاوہ کچھ نہیں ہے ۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں : آگاہ ہو جاؤ آج صرف عمل ہے حساب نہیں ہے اور کل صرف حساب ہے عمل کی گنجائش نہیں ہے (۱) اسی طرح انسانی ادراک اس دنیا میں ایک محدود پیمانہ تک ممکن ہے، لیکن آخرت میں اس کا ادراک اتنا بڑھ جائے گا جس کی توصیف ممکن نہیں ہے ـــ اسی طرح انسان اس دنیا میں ہمیشہ نقائص و امراض کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے لیکن آخرت میں اس کا کوئی تصور ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ کمال و سعادت اور حیات طاہرہ کی شکل اہل آخرت میں ہوگی ـــ اسی طرح انسان کے پاس جو چیز نہیں ہے اس کے حصول کی کوشش کرتا ہے اور جو چیزیں اس کے پاس ہیں ان سے شکم سیر نہیں ہوتا ۔ لیکن آخرت میں نقص کا احساس بھی نہ ہوگا کہ جس کی وجہ سے وہ عذاب کا شکار ہو کیونکہ وہاں تو خدا کے ارادہ سے تمام وہ چیزیں اس کے لئے مہیا ہیں جن کی وہ خواہش کرتا ہے ۔

---

(۱) شرح نہج البلاغہ ۔ ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۸۴

ان تمام باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے آخرت میں انسان کا محبوب حقیقی مل جائیگا، جس کے وصال کا متمنی تھا وہ، حاصل ہو جائے گا اور جس کے فراق میں محزون رہتا تھا، وہ نصیب ہو جائے گا اور وہاں کوئی ایسی آرزو ہی نہ ہوگی کہ جس کی تکمیل نہ ہو سکے، یہی وجہ ہے کہ اہل جنت اپنی موجودہ حالت میں کسی بھی تغیر کے خواہشمند نہیں ہوں گے۔ قرآن مجید جنت کی ان نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے جن کا قیاس دنیا کی نعمتوں پر کیا ہی نہیں جا سکتا، چنانچہ ارشاد ہے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا ۚ (س رعد آیت ۳۵)

جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے (اس کا حال یہ ہے کہ) اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اس کے پھل اور اس کا سایہ ہمیشہ رہے گا۔

اس محدود دنیا کے رہنے والوں کے لئے جنت کی نعمتوں کی تمثیلی تصویر کشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے آیت نے جنت کی صفت من باب التمثیل بیان کی ہے اور اس لئے کہ مطلب ذہن کے قریب آجائے، ورنہ دنیا کے ان باغات وتفریح گاہوں کے مقابلے میں کہ جن میں انسان سیر وتفریح کا آرزومند ہوتا ہے اور صبح کے وقت اس کی تازہ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں بھرنا چاہتا ہے جنت کے باغات کہیں زیادہ بہتر ہیں جنت کے میوے نہ فصلی ہیں نہ موسمی اور نہ ان کو کوئی آفت پہنچتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ نیک اور پاکیزہ بندوں کے تصرف میں رہتے ہیں، جنت کے درختوں کا سایہ دنیاوی درختوں کے سایہ کی طرح نہیں ہے جو سورج کے رحم وکرم پر ہوتا ہے اور تدریجی طور پر اس میں حرکت ہوتی ہے اور موسم خزاں میں اس کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ سائے سے محروم ہو جاتا ہے، مختصر یہ کہ جنت کے درختوں کا سایہ جنت کی دیگر نعمتوں کی طرح دائمی ہوتا ہے اور جنت کے ساکن ہمیشہ اس سے نشاط وسرور حاصل کرتے ہیں۔

قرآن انسان کو بعث و نشور کے حقائق کے ادراک سے عاجز کہتا ہے اسی لئے ارشاد ہوتا ہے: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (س سجدہ آیت ۱۷) پس کوئی نفس اس بات کو نہیں جانتا کہ اس کے خنکیٔ چشم کے لئے کیا کیا چیزیں چھپا رکھی گئی ہیں، یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہوگا جو وہ کیا کرتے تھے ــــــ

اسی طرح جنت کی نعمتیں بھی نوع یا جنس کے لحاظ سے محدود نہیں ہیں قرآن کہتا ہے: وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (س زخرف آیت ۷۱) اور ان میں وہ چیزیں ہوں گی جن کو دل چاہے اور جن سے آنکھیں مزے اٹھائیں اور تم ان (جنتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے ــــــ ہم کو معلوم ہے کہ خدا کے افعال اس کے ارادے اور قدرت سے مکمل ہوتے ہیں۔ خدا کے چاہتے ہی اس چیز کا وجودِ خارجی متحقق ہو جاتا ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے: إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ (س نحل آیت ۴۰) ہم جب کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا اتنا کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا، پس وہ ہو جاتی ہے۔

نظامِ آخرت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اہلِ جنت ایک ایسی منزل تک پہنچ جاتے ہیں جہاں ان کے اعمال صبغۂ الٰہی میں مصبوغ ہو جاتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ان کا ارادہ ہی عمل بن جاتا ہے وہ کسی جسمانی طاقت یا دنیاوی وسیلے کے محتاج نہیں رہتے چنانچہ قرآن کہتا ہے: لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ذَٰلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (س زمر آیت ۳۴) ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس جو کچھ وہ چاہیں گے موجود ہے نیکوکاروں کا بدلہ یہی تو ہے۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ لَهُمۡ فِیۡهَا مَا یَشَآءُوۡنَ ؕ كَذٰلِكَ یَجۡزِی اللّٰهُ الۡمُتَّقِیۡنَ (س نحل آیت ۳۱)

دوامی باغات ہیں جن میں وہ داخل ہو جائیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں جو کچھ وہ چاہیں گے ملے گا۔ ان پرہیزگاروں کو خدا ایسی ہی جزا دے گا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: مختلف گچھوں میں وہ میوے ہوں گے اور بغیر کسی زحمت کے توڑ لئے جائیں گے، وہ میوے توڑنے والے کی خواہش کے مطابق ہوں گے۔

اسی طرح عذاب آخرت کا انسانی عقل تصور بھی نہیں کر سکتی۔ زبان عذاب الٰہی کی تصویر کشی سے عاجز ہے۔ قرآن مجید اصحاب جہنم کی حالت اور عذاب کی تصویر کشی کرتا ہے

وَمَآ اَدۡرٰىكَ مَا الۡحُطَمَةُ ؕ نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ۙ الَّتِیۡ تَطَّلِعُ عَلَی الۡاَفۡـِٕدَةِ ؕ

(س ھمزہ آیت ۵، ۶) اور تم کیا سمجھتے ہو کہ بھسم کرنے والی کیا ہے؟ وہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے۔ جو دلوں تک جا چڑھے گی۔

واقعاً یہ بہت ڈراؤنی ہے، اس آگ کا ایندھن مجرم لوگ بنیں گے اور جہنمی جائیں، ایک اور جگہ قرآن اعلان کرتا ہے، یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِیۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ عَلَیۡهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (س تحریم، آیت ۶) اے ایمان لانے والو اپنے آپ کو اپنے بال بچوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس پر نہایت تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو خدا کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کرتے اور جو کہا جاتا ہے وہ کرتے ہیں ——

اور کتنا سخت موقف وہ ہے جہاں عذاب سے فرار ممکن نہیں، نہ تو موت بچا سکتی ہے اور نہ ہی کوئی چھٹکارا ممکن ہے۔ قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

مِّنْ وَّرَائِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّاۤءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ۔ (س ابراہیم آیت ۱۶، ۱۷) اس کے آگے جہنم ہے اور پیپ کے پانی میں سے اس کو پلایا جائے گا۔ وہ گھونٹ گھونٹ کرکے اُسے پیئے گا پھر بھی حلق سے اتار سکے گا اور موت اس کو ہر طرف سے آئے گی حالانکہ وہ مرنے والا نہ ہوگا اور اس کے آگے اور سخت عذاب ہوگا۔

حضرت علیؑ دعائے کمیل میں خالق قہار کی جزا اور آخرت کے عذاب کی شدت و عظمت کی اس طرح تصویر کشی فرماتے ہیں: میرے معبود! تو خوب جانتا ہے کہ میں دنیا کی تھوڑی سی مصیبت اور عذاب کے اور دنیا کے اندر اہل دنیا پر جو شدائد گزرتے ہیں ان کے اٹھانے سے کمزور و ضعیف ہوں۔ حالانکہ وہ بلا و مصیبت بہت تھوڑی دیر کی ہے اس کی بقا بہت مختصر ہے اس کا قیام بہت ہی قلیل ہے۔ (جب میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا تو) پھر آخرت کی بلاؤں کو اور آخرت کے عظیم شدائد کو کیونکر برداشت کروں گا! جبکہ وہ بلائیں ایسی ہوں گی کہ ان کی مدت طویل ہوگی، ان کی بقا دائمی ہوگی ان میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی کیونکہ وہ تیرے غضب و انتقام و ناراضگی کی وجہ سے ہوں گی اور (تیرے غضب) کو تو زمین و آسمان بھی نہیں برداشت کر سکتے پھر اے میرے مولا میں کیونکر برداشت کر سکتا ہوں، کیونکہ میں تو تیرا ایک کمزور، ذلیل، حقیر، مسکین اور مستکین بندہ ہوں۔

خلود و دوام کے تحقق کے لئے یہ بات کافی ہے کہ خدا مواد عالم کو اصل کھولت اور شیخوخت (انحطاط) سے ختم کر دے تو اس وقت آخرت کی خصوصیات واضح ہو جائیں گے اور ہر موجود ــــــ خواہ نعمت ہو یا نقمت ــــــ رنگ خلود سے متصف ہو جائے گا، کیونکہ اگر یہ اصل عالم دنیوی پر چھائی ہوئی نہ ہو تو نہ کسی کو موت آئے گی نہ ہی کوئی

فنا ہوگا اور ہم سب کے سب اسی دنیا میں لباس بقا پہن لیتے۔ پس معلوم ہوا کہ موت و فنا کی علت وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم گڑگڑاتے ہوئے خدا کی طرف متوجہ ہوں اور عاجزی کے ساتھ اس سے دعا کریں۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا (س فرقان آیت ۶۵) اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے پالنے والے ہم سے عذاب جہنم کو دور کر دے۔ یقیناً اس کا عذاب دائمی و پائدار ہے۔

یہ بات اپنی جگہ پر صحیح و درست ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کا لطف عمومی ہے اور سب کو شامل ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مطلق عقوبت و عذاب کی نفی کر دی جائے خدا کی غیر متناہی رحمت کی یہ تفسیر کرنا کہ وہ ظلم و تجاوز کو دوست رکھتا ہے اور باطل کو پسند کرتا ہے اور اس کے نزدیک ظالم و مظلوم برابر ہیں بالکل غلط ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا اس کی عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مخلوق کو جس کا وہ مستحق ہے وہ عطا کرے اور یہی حکمت اور انضباطِ عالم اور نظام عالم کی تدبیر اور عدل الٰہی کا قانونِ عام ہی ہے کہ جس نے دنیا کو ایک بہترین اور مضبوط نظام کی صورت میں پیدا کیا۔

جس وقت انسان قوی و برتر و مقتدر ارادے کے ساتھ اس دنیا کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو وہ قطعی طور پر غیر متناہی طاقت کا محتاج ہوتا ہے اور وہ اس مالک مطلق کے حضور میں ایک ذلیل و کمزور ہوتا ہے۔ اب اگر وہ وجود رفیع جو تمام سرکشوں اور ظالموں پر مسلط ہے ان کے اعمال کی سزا نہ دے اور ان کی ناک نہ رگڑے تو پھر عدل و حکمت ایک بے معنی کلمے ہو کر رہ جائیں گے پس کیا خدا ان جباروں، لوگوں کا خون چوسنے والوں پر بھی عطوفت و مہربانی کریگا جنہوں نے اپنے اعمال قبیحہ سے تاریخ بشری کے چہرے کو سیاہ کر دیا ہے؟ اور کیا خدا ایسے لوگوں کے لئے محفلِ انس اور امن و استقرار کی جگہ مہیا کرے گا؟ کیا ایسے

ظالموں اور جابروں پر جہنم کا عذاب کرنا عین عدالت و رحمت نہ ہوگا؟ اور کیا کوئی بھی صاحب عقل یہ تصور کر سکتا ہے کہ دنیا ایسی بے کار و بے مصرف ہے کہ جہاں پر مفسدوں، سرکشوں، ظالموں کو ان کے بُرے اعمال کی سزا نہیں ملے گی؟ کیا ہم اپنے وجود کے کسی بھی گوشہ میں کوئی عبث و بیکار چیز پا سکتے ہیں؟

گنہگاروں اور خطا کاروں کو ہم نے دیکھا ہے کہ جب ان کے ضمیر کا دباؤ بڑھ جاتا ہے تو ندامت و پریشانی کے وقت واضح طور سے ان کے چہروں سے عذاب و تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ یہی ندامت گنہگاروں کے لیے چھوٹا سا جہنم ہے جس میں ان کے دل جلتے ہیں اور یہی محکم دلیل ہے کہ نظام وجود میں حق و باطل کو تمیز کرنے کا معیار ہے اور لوگوں کے اعمال کے پرکھنے کی میزان ہے۔

خدا کو اس وقت تک عادل و رؤف کہا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ وہ فاسد عناصر کو ان کے بُرے اعمال کا مزہ نہ چکھا دے۔ اور درحقیقت عدل مطلق یہی ہے کہ جس میں ذرّہ برابر خیر یا شر ضائع نہ ہو بلکہ اس کا بدلہ مل جائے۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: اگر ظالم کو کچھ دنوں کی مہلت مل گئی ہے تو خدا کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ خدا تو اس کی تاک میں ہے، اس کے راستے پر اور اس کے گلے میں ہڈی پھنسنے کی جگہ پر۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں: خدا کی قسم سعدان (ایک خاردار قسم کا درخت) کے کانٹوں پر لیٹ کر جاگتے ہوئے شب بسر کرنا اور زنجیروں میں جکڑ کر کھینچا جانا میرے نزدیک اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے کہ قیامت میں خدا اور اس کے رسولؐ سے اس حالت میں ملاقات کروں کہ بعض بندوں پر ظلم کئے ہوئے ہوں یا دنیا کی کسی چیز کا غاصب ہوں اور بھلا میں کسی پر اس نفس کے لئے کیونکر ظلم کر سکتا ہوں جس کی بازگشت کہنگی کی طرف ہو اور خاک میں مل جانا اس کا مقدر بن چکا

عالمِ برزخ

دینِ اسلام کا ایک عقیدہ "وجودِ برزخ" کا بھی ہے یعنی انسانی روحیں مرنے کے بعد ایک غیر مادی عالم اور وسیع افق کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔

عربی زبان میں کسی بھی دو چیزوں کے درمیان حدِ فاصل کو برزخ کہتے ہیں اور چونکہ دنیاوی فانی زندگی اور اخروی دائمی زندگی کے درمیان یہ "عالم بعد الموت" حدِ فاصل ہوتا ہے لہٰذا اسے برزخ کہا جاتا ہے اس عالم میں زندگی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ روح اپنی جسمانی قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ عالم برزخ میں نہ زمان و مکان کی قید و بند ہوتی ہے اور نہ انسانی روح نفسانی شہوتوں کے حصار میں مقید ہوتی ہے بلکہ بتعبیرِ استطاعت انسانی نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اسے اس طرح سمجھئے خواب میں جس طرح اپنے کو زمان و مکان سے آزاد پاتا ہے اور جس وقت جہاں چاہے سفر کر سکتا ہے، وہی عالم برزخ میں روح کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (س مومنون آیت ۱۰۰) اور ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ ہے، جہاں اس دن تک کہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے (رہنا ہوگا) اسی طرح قرآن کریم شہداء کی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (س آل عمران آیت ۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ جیتے (جاگتے موجود) ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں سے وہ (طرح طرح کی) روزی پاتے ہیں۔ اسی طرح قیامت سے پہلے اہل جہنم کے عذاب کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ

(سورہ توبہ آیت ۴۹) اور ان لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو صاف کہتے ہیں کہ مجھے تو پیچھے رہ جانے کی ـــــ اجازت دیجئے اور مجھے بلا میں نہ پھنسائیے (اے رسولؐ) آگاہ ہو کہ یہ لوگ خود بلا میں (اوندھے منہ) گر پڑے اور جہنم تو یقیناً کافروں کو گھیرے ہی ہوئے ہے۔

نیک لوگوں کی روحیں مرنے کے بعد مسرت و سرور میں ڈوبی رہتی ہیں کیونکہ دنیا کے محدود قفس سے ان کو آزادی مل چکی ہوتی ہے، دنیاوی زندگی میں یہ روحیں مادہ کے ایک بہت ہی کمزور جزو سے متعلق ہوتی تھیں ـــــ لیکن برزخ میں صالحین کی ارواح کی سیر صعودی کے لئے کوئی حد ہوتی ہے، نہ زمان و مکان کی احتیاج ہوتی ہے، اور ان روحوں کے لئے اپنے اپنے مرتبہ کے لحاظ سے معین درجہ ہوتا ہے اور یہ روحیں اس مقام رفیع تک پہنچ جانے کی وجہ سے سعید ہوتی ہیں اور ان میں بسہولت ہر جگہ کے ادراک کی استطاعت ہوتی ہے اور ان کے سامنے ایسے خوبصورت مناظر ہوتے ہیں جو دل کو مسحور اور عقل کو مسلوب کر لیتے ہیں اور آنکھیں وہاں پر ایسے والی منابع کا مشاہدہ کرتی ہیں کہ جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوتے ہیں اور کائنات کی تمام خوبصورتیاں ان کے مقابلے میں حقیر و ذلیل معلوم ہوتی ہیں۔

اور یہ روحیں وہاں پر جسم مادی کے ثقیل و زائل سے منزہ و مبرا رہتی ہیں، لہٰذا جسم کی محدودیت اور بڑھاپا جیسی چیزوں کا وہاں گزر بھی نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے نیک بندوں کے لئے وہاں جو کچھ بھی ہے وہ جمال و نور ہے، محبت و الفت و خلوص و صداقت ہے وہاں ریاکاری کا شائبہ بھی نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ اور مقرب بندوں کی ہمنشینی بھی نصیب ہوتی ہے۔

اور جن لوگوں نے اطاعتِ الٰہی کو اپنا عنوانِ زندگی بنا رکھا ہے ان کو قرآن اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب اللہ کے خالص بندوں کے ساتھ معاشرت کریں گے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست کریں گے، البتہ ان لوگوں کی معاشرت جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کر دی ہے

انسان اپنی تمام سابقہ معلومات کی بنا پر نظام وجود کے عظمت اور وسعت کی بنا پر تمام وجود کا تمام ابعاد کے لحاظ سے احاطہ نہیں کرسکتا اور جب ایسا ہے تو تمام مجہولات کا انکار بھی نہیں کرسکتا، محض اس بنا پر کہ وہ ان کو نہیں جانتا کیونکہ ابھی تک ایسے عوالم کے بارے میں جو ہماری دسترس سے باہر ہیں، خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی ہے اور اگر کوئی اس کا انکار بھی کرتا ہے تو وہ انکار نامعقول ہے اور نفی و انکار تو بہت ہی آسان ہے۔ بہت سے لوگ اپنی کج بحثی میں اسی نفی و انکار کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ اپنی نفی و انکار پر کوئی مقنع دلیل نہیں پیش کرسکتے کہ ہمارے عالم کے علاوہ کسی دوسرے عالم کا وجود نہیں ہے ابھی تک تو کوئی بڑے سے بڑا ایسا عالم و محقق نہیں پیدا ہوا جو نظام عالم کے تمام ابعاد پر سیر حاصل بحث کرسکے اور اس کے تمام جوانب میں غور و فکر کرکے اپنے دقیق تجربہ اور معلومات کی بنا پر قطعی و یقینی طور پر اعلان کرے کہ ہمارے تجربے کا نتیجہ یہ ہے کہ جنت و نار کا وجود نہیں ہے۔

آج کا انسان جو ایک منٹ بھی آفاق جدیدہ کی تسخیر سے توقف نہیں کرتا لیکن عالم وجود کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہم ان سیاروں کو ـــــ جو زمین کے گرد صرف سات سکینڈ میں دورہ کر لیتے ہیں ـــــ اپنے قابو میں کرنا چاہیں تو تقریباً ایک کروڑ سال کی ضرورت پڑے گی۔

پس یہ معارف جن تک انسان پہنچا ہے وہ ایک دو دن کی زحمت کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ نسل در نسل وسائل کے استعمال اور علمی ترقی کا نتیجہ ہے اور اس ساری تحقیق کے باوجود احتمال قوی ہے کہ اس فضا میں ایسے عوالم بھی موجود ہیں۔ جن کے نظام کی معرفت تک ہماری دسترس ابھی تک نہیں ہوئی اور ان عوالم کے نفی امکان پر کوئی قطعی دلیل بھی موجود نہیں ہے۔

انسٹائن (EINSTEIN) کہتا ہے: وجود کی پہیلی اب تک ناقابل حل ہے اور ہمیں اس کا ابھی اطمینان نہیں ہے کہ یہ مستقبل بعید میں حل ہو جائے گا کتاب فطرت کا ہم نے اب تک جتنا مطالعہ کیا ہے اس سے بہت سی چیزوں کا علم ضرور ہوا ہے اور ہم نے بہت کچھ پڑھا اور سمجھا بھی ہے لیکن ابھی تک بہت سی باتیں ناقابل حل ہیں اور آخر میں صرف

ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کیا اس کا حل ممکن ہو سکے گا یا نہیں؟[1]

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ وجود جنت و نار کی صریحی نفی کسی بھی منطقی دلیل کے مطابق نہیں ہے اور ان تمام باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے عرض ہے کہ جب صحیفۂ زمان لپیٹ دیا جائے گا اور دونوں عالموں کے مابین فاصلہ کی حرکت ختم کر دی جائے گی تو پھر کوئی ایسی زمانی نسبت نہ ہو گی جس کے حساب سے قبل یا بعد کا اطلاق کیا جائے ــــــــ

ہم اپنی غلطیوں کا تدارک کیونکر کریں؟

جس طرح بہت سے جسمانی امراض ہوتے ہیں کہ علاج و معالجہ سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح روح اگر نفسانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے تو اس کا بھی علاج ممکن ہے۔

اسلام نے روحانی بیماریوں کے علاج کے لئے توبہ کا دروازہ کھول دیا ہے کہ اس دروازے سے آدمی دوبارہ نیکوئی اور سعادت کی طرف واپس آسکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ فضل و رحمت الٰہی کی امید کا دروازہ بھی کھول دیا ہے کہ گنہگار مایوسی کا شکار نہ ہو۔

چنانچہ انبیاء کرام جو اپنی پوری زندگی میں کبھی بھی گناہ نہیں کرتے تھے انہوں نے ہمیشہ منحرف شدہ لوگوں کو توبہ و استغفار کی طرف دعوت دی ہے تاکہ وہ نجات حاصل کر سکیں اور اپنے اعمال و افکار کی اصلاح کر سکیں۔ اسی طرح لوگوں کے دلوں میں مغفرت الٰہی کا چراغ روشن کیا کیونکہ اپنے مومن بندوں پر خدا کی رحمت و فضل اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ وہ اپنے بندوں کو محض لغزش یا انحراف کی

---

[1] خلاصہ فلسفی نظریہ انشائن ص ۱۹، ۲۰

وجہ سے چھوڑ دے۔ انبیائے کرام نے تمام لوگوں کو اس طرف بلایا ہے اب یہ ہمارا کام ہے کہ
ہم خدا کی دعوت کو قبول کریں اور اپنے نفسوں کو عذاب سے چھٹکارا دلائیں۔

خداوند عالم کی طرف سے توبہ کا قبول کیا جانا خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انسان میں رحمتِ
پروردگار عالم کے جلب کرنے کی ایک مخصوص اہلیت ہے اور یہی اہلیت انسان کو آمادہ کرتی ہے کہ
وہ اپنے لئے مغفرت کے دروازے کھلوائے۔ لہٰذا جب تک فرصت باقی ہے گنہگاروں کو چاہئے
کہ ہمیشہ پروردگار عالم اپنے سیاہ ماضی پر ندامت و پشیمانی کا اظہار کر کے اور اپنے گناہوں سے
بچ کر سابق غلطیوں کا ازالہ کریں۔ اور اگر ایسا کر لیا تو ان کی برائیاں نیکیوں میں اور تاریکی نور میں بدل جائے گی
ایسے حالات میں اگر انسان امر الٰہی کی اطاعت کی خاطر توبہ کرے تو اس کی روح کے آفاق ظاہر ہو جائیں
گے۔ اور سیاہ گناہوں کے دھبے اس کے دامن سے ناپید ہو جائیں گے۔ اور عمل صالح کا نامہ سفید
ہو جائے گا۔ اسی بات کو قرآن نے کہا ہے: اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا
فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا
(سورہ فرقان آیت ۷۰) البتہ جو لوگ (اپنے گناہوں سے) توبہ کر لیں اور ایمان لائیں اور عمل صالح کریں تو پھر
خدا ان کے سیئات کو حسنات میں بدل دے گا اور خدا تو بہت بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

لیکن مغفرت الٰہی سے مایوسی اور ہمیشہ احساس گناہ انسان کو تلخیوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور خود گنہگار
شخص پر اور اس کے معاشرے پر اس کے بہت ہی بُرے آثار مرتب ہوتے ہیں۔

مگر توبہ کی قبولیت کی امید تو ان اہم اسباب میں سے ہے جس کے ذریعے انسان اپنی باقی عمر
کے حصے میں روح کو کثافتوں سے بچا لیتا ہے اور اگر (خدا نخواستہ) گنہگاروں کو یہ امید نہ عطا کی گئی
ہوتی اور نجات کا ان کے لئے کوئی دروازہ نہ کھولا جاتا تو وہ لوگ اپنی باقی ماندہ عمر میں نہ تو اپنی اصلاح کی
طرف متوجہ ہوتے اور نہ کسب نیکی کرتے اس کے برخلاف روز بروز ان کے گناہوں میں اضافہ
ہوتا جاتا اور نامۂ اعمال سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جاتا۔ اور مفاسد کا انبار لگ جاتا اور وہ لوگ اپنی زندگی کی

تو پھر ایسے شخص کی توبہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ جانکنی کے وقت پروردگار کے سامنے سے جب پردہ اٹھ جاتا ہے اور وہ واقع کو دیکھ لیتا ہے تو اپنے برے اعمال پر نادم ہوگا ہی اور ایسے شخص کی مثال اس مجرم کی سی ہے جسے پھانسی کا حکم سنایا جا چکا ہے اور وہ تختۂ دار پر بھی پہنچ چکا ہے اور اب نادم ہو تو اس کی ندامت کا اس وقت کوئی فائدہ نہیں اور نہ یہ باعثِ فخر ہے اور نہ باعثِ فضیلت اور اب توبہ کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔

قرآن وضاحت کے ساتھ بیان کر چکا ہے: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔

(سورہ نساء، آیت ۱۸): توبہ ان لوگوں کے لئے ہے کہ جو برائیاں کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کے سامنے موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں اور نہ توبہ ان لوگوں کے لئے ہے جو حالتِ کفر میں مرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

ایک شخص نے حضرت علیؑ کے سامنے کہا کہ میں غفلت اور عدم توجہ پر خدا کی بارگاہ میں استغفار کرتا ہوں! یہ سنتے ہی حضرتؑ نے فرمایا! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے! کیا تو جانتا ہے کہ استغفار کیا ہے؟ (س) استغفار علیین کا درجہ ہے۔ استغفار کے لئے چھ شرطیں ہیں ۱۔ گزرے ہوئے گناہوں پر ندامت و پشیمانی ۲۔ عزم محکم کہ اب کبھی یہ کام نہ کروں گا ۳۔ مخلوقِ خدا کے حقوق ان تک پہنچاتے رہو جب تک لقائے الٰہی نہ ہو اور خدا سے اس عالم میں ملاقات ہو کہ تمہارے ذمہ کچھ نہ ہو ۴۔ ہر اس فریضہ کی کوشش کرو جس کو تم نے ضائع کر دیا اور اس طرح کہ اس فریضہ کا حق ادا ہو جائے ۵۔ اس گوشت کی طرف متوجہ ہو جو حرام سے اُگا ہے۔ رنج و غم سے اُسے اتنا گھلا دو کہ کھال ہڈی سے چپک جائے۔ اور کھال و ہڈی کے درمیان نیا گوشت پیدا ہو جائے۔ ۶۔ جسم کو اطاعت

کا موجو چکا ہو جس طرح معصیت کی شناسائی کھلائی ہے جب یہ ساری باتیں ہو جائیں، تب کہیں توبہ ہوتا[1]

اعتراف گناہ اور بارگاہ الٰہی میں توبہ اور اس کی ذات مقدسہ سے طلب عفو انسان کی قدر و قیمت خدا کے نزدیک گھٹاتا نہیں بلکہ اسے بلندی عطا کرتا ہے اور روح انسانی میں جو سیاہ دھبے پڑ چکے ہیں انہیں ختم کر دیتا ہے اور پھر خدا کی مدد سے نئے سرے سے انسان اپنی غلطیوں کی تلافی، اور معنوی شخصیت بنانے کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اور ادائے واجبات میں منہمک ہو جاتا ہے

انسان مومن جب اپنے باطن میں گناہ کی تاریکی محسوس کرتا ہے تو اس کی تلافی کی کوشش کرتا ہے اور وہ جبران سیاہ بختی و رحمت کی طرف توجہ اور اس سے توسل کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا

خداوند عالم اپنی کتاب محکم میں ارشاد فرماتا ہے، وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ - (س آل عمران آیت ۱۳۵)

جو لوگ کوئی برا کام یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں خدا کی یاد آتے ہی اپنے گناہوں سے استغفار کرتے ہیں اور خدا کے علاوہ گناہوں کو بخش بھی کون سکتا ہے؟ اور جان بوجھ کر اس برائی کا پھر ارتکاب نہیں کرتے۔

خداوند عالم کی بارگاہ میں وہ سچی توبہ جس کو عفو و لطف پروردگار عالم شامل ہوتا ہے، اس کی قرآن اس طرح وضاحت کرتا ہے کہ، اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (س النساء آیت ۱۷) یقیناً خدا ان لوگوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے جو نادانی سے کسی برائی کو کر ڈالتے ہیں اور پھر فوراً توبہ کرتے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن کی خدا توبہ قبول کر لیتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ حاشیہ ڈاکٹر صبحی صالح ص ۵۴۹

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو لوگ اپنے نفس کی فلاح چاہتے ہیں ان کو خدا کی بارگاہ میں توبہ کرکے اپنے اعمال کی اصلاح کرنی چاہیئے۔

قرآن کہتا ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

(س نور، آیت ۳۱) اے مومنو تم سب خدا کی بارگاہ میں توبہ کرو تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔

گناہوں کی کثرت اور عادی ہو جانے کی وجہ سے جب تک انسان کے دل پر تاریکی نہ چھا جائے اور جب تک بار بار معصیت کرنے کی وجہ سے اس کے دل پر معصیت کی مہر نہ لگ جائے گناہ کے کیچڑ میں گرتے ہی اسے فوراً احساس ہو جاتا ہے کہ امر الٰہی کی مخالفت کرنے کی وجہ سے وہ ملوث ہو گیا اور جیسے ہی معصیت کی قباحت کا احساس کرتا ہے فوراً ہی گڑگڑاتا ہوا تضرع و زاری کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں طالب عفو و مغفرت ہو جاتا ہے، اور اپنے کئے ہوئے گناہ پر پشیمانی و ندامت کا اظہار کرتا ہے۔

خداوند عالم انسان کو متوجہ کرتا ہے کہ آثار گناہ ختم کرنے کا کوئی راستہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ خالص و صاف اور ایسی توبہ کرے جس کے بعد دوبارہ گناہ کا ارتکاب نہ کر سکے۔ بس یہی ایک طریقہ ہے جس سے وہ گزرے ہوئے اعمال کے دھبوں سے اپنے دامن کو پاک بنا سکتا ہے، اور یہی توبہ و ندامت وہ چیز ہے جو قلب انسانی کو پاک کر دیتی ہے اور صرف یہی چیز ہے جس سے گناہوں کا اصلاح کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ استغفار توبہ و ندامت نہیں ہوتا بلکہ صرف لقلقۂ زبان ہوتا ہے اور اسی بات کی طرف قرآن متوجہ کرتا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَصُوحاً عَسَى رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ سَيِّئَاتِكُمْ (س تحریم، آیت ۸) اے ایمان لانے والو خدا کی بارگاہ میں توبہ نصوح کرو تو خدا تمہارے گناہوں کا کفارہ دے دے۔

مفسرین نے اس بات میں اختلاف کیا ہے کہ "توبہ نصوح" کیا ہے؟ بعض حضرات کا

خیال ہے اس سے مراد وہ توبہ ہے جو اپنے صاحب کو ایسی نصیحت کرے جس سے وہ گناہوں سے باز آجائے اور پھر کبھی گناہ کا ارتکاب ہرگز نہ کرے۔[۱]

حضرت علیؑ گناہوں سے بچنے کو عزت و شرف نفس کا کامیاب عامل تصور فرماتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ جب کسی بندے کا نفس اس کے نزدیک محترم و مکرم ہوجاتا ہے تو دنیا اس کی نظروں میں ذلیل ہوجاتی ہے۔[۲]

لہٰذا ہر اس انسان پر جو اس فانی زندگی میں لغزش ———— سے دوچار ہے واجب ہے کہ وہ متوجہ و ملتفت رہے تاکہ منطقۂ ممنوعہ کے قریب بھی نہ جاسکے اور یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیئے کہ انسان کا سچا ایمان جتنا زیادہ ہوگا، مجال فکر و عمل میں اس کے انحصارات بھی زیادہ ہونگے اس لئے اب یہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے گناہوں سے بچنے کا ایک معیار و ماوائی تلاش کریں اور اپنی غلطیوں کی اصلاح کریں۔ اس سے زیادہ فرصت و مہلت کو ضائع نہ کریں۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں: خدا تم پر رحم کرے واضح نشانوں کے ساتھ عمل کرو، نیک راستہ تمہیں دارالسلام کی طرف بلا رہا ہے۔ تمہیں اس دنیا میں مہلت و فراغت حاصل ہے اسے برباد نہ کرو) ابھی نامۂ اعمال کھلے ہوئے ہیں، قلم جاری ہے۔ بدن صحیح سلامت ہے، زبان آزاد ہے، توبہ سنی جاسکتی ہے، اعمال قبول ہوسکتے ہیں![۳]

---

[۱]: سفینۃ البحار ج ۱ ص ۱۲۶

[۲]: غرر الحکم ص ۷۰

[۳]: نہج البلاغہ شرح فیض الاسلام ص ۲۸۱

عالم برزخ

دین اسلام کا ایک عقیدہ "وجود برزخ" کا بھی ہے یعنی انسانی روحیں مرنے کے بعد ایک غیر مادی عالم اور وسیع افق کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں۔

عربی زبان میں کسی بھی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل کو برزخ کہتے ہیں اور چونکہ دنیاوی فانی زندگی اور اخروی دائمی زندگی کے درمیان یہ عالم بعد الموت "حد فاصل" ہوتا ہے لہٰذا اسے برزخ کہا جاتا ہے اس عالم میں زندگی کی صورت یہ ہوتی ہے کہ روح اپنی جسمانی قیود سے آزاد ہو جاتی ہے۔ عالم برزخ میں نہ زمان و مکان کی قید و بند ہوتی ہے اور نہ انسانی روح نفسانی شہوتوں کے حصار میں مقید ہوتی ہے بلکہ بتعبیر استطاعت انسانی نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اسے اس طرح سمجھئے خواب میں جس طرح اپنے کو زمان و مکان سے آزاد پاتا ہے اور جس وقت جہاں چاہے سفر کر سکتا ہے، وہی عالم برزخ میں روح کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ (س مؤمنون آیت ۱۰۰) اور ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ ہے جہاں اس دن تک کہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے رہنا ہوگا۔ اسی طرح قرآن کریم شہداء کی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (س آل عمران آیت ۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انہیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ جیتے جاگتے موجود ہیں اور اپنے پروردگار کے یہاں سے وہ طرح طرح کی روزی پاتے ہیں۔ اسی طرح قیامت سے پہلے اہل جہنم کے عذاب کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ

(س توبہ آیت ۴۹) اور ان لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو صاف کہتے ہیں کہ مجھے تو ـــــ پیچھے رہ جانے کی ـــــ اجازت دیجئے اور مجھے بلا میں نہ پھنسا دیجئے (اے رسولؐ) آگاہ ہو کہ یہ لوگ خود بلا میں (اوندھے منہ) گر پڑے اور جہنم تو یقیناً کافروں کو گھیرے ہی ہوئے ہے۔

نیک لوگوں کی روحیں رہنے کے بعد مسرت و سرور میں ڈوبی رہتی ہیں کیونکہ دنیا کے محدود قفس سے ان کو آزادی مل چکی ہوتی ہے، دنیاوی زندگی میں یہ روحیں مادہ کے ایک بہت ہی کمزور جزو سے متعلق ہوتی تھیں ـــــ لیکن برزخ میں صالحین کی ارواح کی سیر صعودی کے لئے کوئی حد نہیں ہوتی ہے، نہ زمان و مکان کی احتیاج ہوتی ہے۔ اور ان روحوں کے لئے اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے معین درجہ ہوتا ہے اور یہ روحیں اس مقام رفیع تک پہنچ جانے کی وجہ سے سعید ہوتی ہیں اور ان میں بسہولت ہر جگہ کے ادراک کی استطاعت ہوتی ہے اور ان کے سامنے ایسے خوبصورت مناظر ہوتے ہیں جو دل کو مسرور اور عقل کو مسلوب کر لیتے ہیں اور آنکھیں وہاں پائے جانے والی منابع کا مشاہدہ کرتی ہیں کہ جو ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہوتے ہیں اور کائنات کی تمام خوبصورتیاں ان کے مقابلے میں حقیر و ذلیل معلوم ہوتی ہیں۔

اور یہ روحیں وہاں پر جسم مادی ثقیل و زائل سے منزہ و مبرا رہتی ہیں، لہٰذا جسم کی محدودیت اور بڑھاپا جیسی چیزوں کا وہاں گزر بھی نہیں ہو سکتا۔

اللہ کے نیک بندوں کے لئے وہاں جو کچھ بھی ہے وہ جمال و نور ہے، محبت و الفت و صفا و صداقت ہے وہاں ریاکاری کا شائبہ بھی نہیں ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ اور مقرب بندوں کی ہمنشینی بھی نصیب ہوتی ہے۔

اور جن لوگوں نے اطاعت الٰہی کو اپنا عنوان زندگی بنا رکھا ہے ان کو قرآن اس بات کی بشارت دیتا ہے کہ یہ لوگ عنقریب اللہ کے خالص بندوں کے ساتھ معاشرت کریں گے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست کریں گے۔ البتہ ان لوگوں کی معاشرت جن پر خدا نے اپنی نعمت تمام کر دی ہے

وہ متقین کے مفاخر میں شمار ہوتی ہے۔ بشارتِ الٰہی ملاحظہ ہو:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۔ (سورہ نساء آیت ۶۹) اور جس شخص نے خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی تو ایسے لوگ ان (مقبول) بندوں کے ساتھ ہوں گے جنھیں خدا نے اپنی نعمتیں دی ہیں یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ لوگ کیا ہی اچھے رفیق ہیں۔

یہ بات ضرور یاد رکھنے کی ہے مقربین کی معاشرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ لوگ ہر جہت سے مقربین کے درجوں اور مقامات میں برابر ہیں بلکہ ان میں سے ہر شخص اپنے مقام اور اپنی منزل کے حساب سے الطافِ الٰہی اور برکاتِ خداوندی سے مستفید ہوگا اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کی قربت بھی حاصل ہوگی۔ لہٰذا معنوی رتبہ اور درجہ کے اعتبار سے بھی استفادہ ہر لحاظ سے برابر نہ ہوگا۔

امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی نے حضرتؑ سے یہ سوال کیا: فرزندِ رسولؐ کیا مومن قبضِ روح کو ناپسند کرتا ہے؟ حضرتؑ نے فرمایا: لا واللہ (نہیں نہیں) ایسا نہیں ہے بلکہ جب ملک الموت قبضِ روح کے لئے آتے ہیں تو مومن جزع وفزع کرنے لگتا ہے۔ تو ملک الموت کہتے ہیں اے ولیِ خدا خوف نہ کھا۔ اس خدا کی قسم جس نے محمدؐ کو رسول بنا کر بھیجا میں تمہارے اوپر تمہارے رحیم والدین سے زیادہ شفیق ومہربان ہوں۔ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو! امام معصومؑ فرماتے ہیں جب وہ آنکھ کھول کر دیکھے گا تو اس کے سامنے رسولِ خداؐ، امیر المومنینؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور دیگر ائمہ علیہم السلام موجود ہوں گے اور مرنے والے سے کہا جائے گا یہ حضرات تیرے رفیق ہیں۔ اس وقت ربّ العزت کی طرف سے ایک منادی اس کی روح کو ندا دے گا اے (محمدؐ وآلِ محمدؐ پر) اطمینان رکھنے والے نفس اپنے رب کی طرف اس حالت میں پلٹ آ، راضی (بالولایۃ) اور مرضی (بالثواب) ہو۔ اور میرے بندوں (محمدؐ وآلِ محمدؐ) میں داخل ہوجا اور میری جنت میں

اس وقت اس کے لئے سب سے زیادہ محبوب شئے یہ ہوگی کہ اس کی روح جسم سے نکل کر دینے والے سے ملحق ہو جائے۔[1]

لیکن جو لوگ حق سے منحرف اور گمراہ ہوتے ہیں ان کی روحیں وحشتناک تاریکی میں ڈوبی رہتی ہیں اور وہ ایک غمگین ومضطرب فضا میں اس طرح زندگی بسر کرتی ہیں کہ گناہوں سے بھرپور ماضی پر نادم ہوتی ہیں۔ اپنے اہل واقارب اور امور مادیہ سے عذاب میں مبتلا رہتی ہیں کیونکہ ان چیزوں سے کوئی نجات ممکن نہیں ہے۔

اور ان سے بھی بری حالت ان ظالم جباروں کی ہوتی ہے جو حد سے زیادہ تجاوز کرنے والے ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مظلوموں کی آہوں کے خنجر پیوست ہوتے ہیں اور اشباح مظلومین ان پر وحشتناک طریقے سے حملہ آور ہوتی ہیں اور انہیں زجر وتوبیخ کرتی ہیں اس سے ان کے غموں میں اضافہ ہی ہوتا ہے اور یہ وحشتناک مناظر مجسم ہو کر مجرمین کی روحوں کو معذب کرتے ہیں اور ان کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے ان کے انجام کی اس طرح تصویر کشی کی ہے: اَلنَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ ۔ (سورۂ مومن آیت ۴۶) "اور اب تو قبر میں) دوزخ کی آگ ہے کہ وہ لوگ (ہر) صبح وشام اس کے سامنے لا کھڑے کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا کہ) فرعون کے لوگوں کو سخت سے سخت عذاب میں جھونک دو!

ان حالات میں ان لوگوں کو احساس ہوگا اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ انبیاء اور علماء جن چیزوں سے ڈرایا کرتے تھے اور جس کی خبر دیا کرتے تھے وہ صحیح ہے اور اس وقت انکو حسرت ندامت ہوگی کہ ہم نے انبیاء کے احکام کو کیوں نہیں مانا اور ان کی شفقت آمیز نصیحتوں کو کیوں قبول

---

[1] فروع کافی جزو سوم ص ۱۲۷، ۱۲۸

نہیں کیا اور اس اسفناک انجام کے بارے میں کیوں نہ غور کیا کاش پہلے ان لیتے تو اس خسران مبین سے بچ جاتے ۔

جنگ بدر میں جب قریش کے لیڈر قتل کر دیئے گئے اور ان کی لاشوں کو ایک کنوئیں میں ڈال دیا گیا اور لشکر اسلام فاتح و غالب ہو گیا تو رسول خداؐ اس کنوئیں کے پاس آ کر ان کو فرداً فرداً مخاطب کر کے فرمانے لگے: تمہارے رب نے جس کا وعدہ کیا تھا کیا اس کی حقانیت تم پر آشکارا ہوئی؟ مجھ سے تو میرے رب نے جو وعدہ کیا تھا اس کا حق ہونا مجھے معلوم ہو گیا۔ تم لوگ اپنے نبی کی بدترین قوم تھے۔ تم نے مجھے جھٹلایا جبکہ دوسروں نے میری تصدیق کی۔ تم نے مجھے وطن سے بے وطن کر دیا جبکہ دوسروں نے پناہ دی۔ تم نے مجھ سے جنگ کی دوسروں نے میری مدد کی! اصحاب نے عرض کیا! سرکار کیا مردوں سے گفتگو فرما رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا: ان کو معلوم ہو گیا ہے کہ خدا نے جس کا وعدہ کیا تھا وہی حق تھا۔ دوسری روایت میں ہے کہ میری باتوں کو تم سے زیادہ یہ لوگ سن رہے ہیں البتہ یہ جواب دینے پر قادر نہیں ہیں [1]

حضرت علیؑ کے ایک صحابی ناقل ہیں: میں حضرت علیؑ کے ساتھ پشت کوفہ پر گیا (وہاں) وادی السلام میں آپ نے توقف فرمایا! معلوم یہ ہو رہا تھا کہ آپ کچھ لوگوں سے مخاطب ہیں۔ حضرتؑ کے ساتھ کھڑے کھڑے جب میں تھک گیا تو بیٹھ گیا، لیکن بیٹھے بیٹھے بھی جب خستگی کا احساس ہونے لگا تو میں دوبارہ کھڑا ہو گیا اور عرض کی! مولا آپ اتنی دیر سے کھڑے ہیں مجھے خوف ہو رہا ہے (آپ بیمار نہ ہو جائیں) کچھ دیر استراحت فرما لیجئے یہ کہہ کر میں نے اپنی عبا زمین پر بچھا دی تاکہ حضرت اس پر بیٹھ جائیں! آپ نے فرمایا: اے جبر یہ تو مومن سے

---

[1] بحار جلد ۱۹ ص ۳۴۶ : واقدی کی کتاب المغازی ج ۱ ص ۱۱۲ پر بھی اسی سے ملتی جلتی روایت ہے۔

سے گفتگو یا اظہار موانست ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے (تعجب سے) پوچھا امیر المومنین کیا واقعی ایسا ہے؟ حضرت نے فرمایا: ہاں ہاں اگر پردہ اٹھا دیا جائے تو تم دیکھو گے کہ یہ لوگ حلقہ، حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور محو گفتگو ہیں۔ راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا حضور یہ سب جسم ہیں یا فقط روح! فرمایا: روح۔ [1]

پہلے والی روایت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ روح جب بدن کے ساتھ دنیا میں متحد رہی اور ایک زمانہ تک اس کے ساتھ زندگی بسر کی وہ موت کے ذریعے بدن و روح میں انفصال کے باوجود بالکلیہ بدن سے اپنے علاقہ کو ختم نہیں کر لیتی اور یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ شریر و فاسد روحوں پر برزخ میں جو عذاب کیا جاتا ہے وہ نہ ختم ہوتا ہے اور نہ لحظہ بھر کے لئے رکتا ہے۔

برزخ میں دائمی عذاب پر قرآن کی یہ آیت دلیل ہے: وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۔ (س مومن آیت ۴۵،۴۶) اور فرعونیوں کو بڑے عذاب نے گھیر لیا، ۴۶ ویں آیت مع ترجمہ چند صفحہ پہلے ذکر کی جا چکی ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرعونیوں کو ہر صبح و شام اس آگ کے سامنے لاکر لایا جاتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ قیامت دائمی مستقر کا نام ہے وہاں صبح و شام کا تصور نہیں ہے لہٰذا گفتگو دنیا ہی کے ارد گرد (یعنی برزخ) سے متعلق ہے ــــــــــــ اسی طرح نیکو کاروں کا ذکر بھی قرآن کرتا ہے: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۔ (س مریم آیت ۶۲) وہ لوگ وہاں سلام کے سوا کوئی بیہودہ بات سنیں گے ہی نہیں (ہر طرف سے) سلام ہی سلام (کی آواز آئے گی) اور وہاں ان کا کھانا صبح و شام (جس وقت چاہیں گے) ان کے لئے (تیار) رہے گا۔

اس آیت میں صبح و شام کا تذکرہ ہے اور ظاہر سی بات ہے کہ ان دونوں (صبح و شام) کا وجود دنیا

---

[1]: فروع کافی ج ۳، ص ۲۴۳

کے اندر برزخ ہی میں قیامت سے پہلے ہوگا۔ کیونکہ جنت کی صفت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ
تو وہاں سورج کی گرمی ہوگی اور نہ سردی چنانچہ ارشاد ہے، مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ
فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا (س دھر آیت ۱۳) وہاں وہ تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے
ہوں گے نہ وہاں (آفتاب کی) دھوپ دیکھیں گے اور نہ شدت کی سردی۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد ہے: أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا
وَأَحْسَنُ مَقِيلًا (س فرقان آیت ۲۴) اس دن جنت والوں کا ٹھکانا بھی بہتر ہوگا اور آرام گاہ
بھی اچھی سے اچھی۔ اس آیت میں قابل توجہ لفظ "مقیل" ہے جس کے معنی ظہر سے قبل سونے
کے ہیں اور قیامت میں جنت کے اندر سونے کا مطلب ہی نہیں ہے۔ یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے
کہ جس طرح جنت میں نیند کا تصور نہیں ہے اسی طرح برزخ میں بھی دنیاوی نیند کا تصور نہیں ہے
لیکن درحقیقت برزخ کی نسبت قیامت سے اسی طرح ہے جس طرح نیند کی نسبت بیداری
سے ہے اسی لئے نیند کا اطلاق برزخ کے لئے کیا گیا ہے اور اسی لئے یوم البعث میں صرف اٹھ
کے کھڑے ہونے کا ذکر ہے۔ بلکہ برزخ کی زندگی دنیاوی زندگی سے زیادہ کمل ہے (جیسے نیند
سے زیادہ بیداری کمل ہے) چنانچہ روایت ہے: اَلنَّاسُ نِيَامٌ فَإِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا
لوگ سو رہے ہیں جب مریں گے تو بیدار ہوں گے اس حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے
برزخ کی زندگی زیادہ جامع ہے یعنی جب سوتا ہوتا ہے تو انسان کے احساسات و ادراکات
ضعیف ہوتے ہیں اور وہ نیم بیداری کی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن جب بیدار ہو جاتا ہے
اس کی حیات دوبارہ مکمل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا میں انسان کی زندگی بہت کمزور ہوتی ہے۔ لیکن
جب وہ عالم برزخ میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی زندگی کامل ہو جاتی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں: خواب میں ہم ایک عالم دیکھتے ہیں لیکن اس وقت یہ تصور نہیں
ہوتا کہ ہم خواب دیکھ رہے ہیں اور یہ خواب ہمارے نظام زندگی کا ایک جزو ہے حالانکہ اصل زندگی

بیداری کا نام ہے۔ خواب سے بیدار ہوتے ہی ہم اس بات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں کہ یہ خواب ہماری زندگی کا محض ایک جزو ہے، پھر ہماری دنیاوی زندگی کے مقابلے میں ایک خواب جیسی کیوں نہیں ہو سکتی ؟ زندگانی دنیا کی حقیقت کا عقیدہ ایسا ہی ہے جیسا کہ سونیوالا حالت خواب میں خواب ہی کو حقیقت سمجھتا ہے ۔

اور یہ کہنا کہ بیداری کے بعد ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ تو صرف خواب و خیال تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوا کرتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مکمل زندگی دو اجزاء سے مرکب ہے، ایک چھوٹا جزو جسے خواب کہا جاتا ہے اور ایک بڑا جزو جسے بیداری کہا جاتا ہے تو چونکہ خواب کی کوئی حقیقت مکمل زندگی کے مقابلے میں کچھ نہیں ہوتی اس لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ بیداری کے بعد ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ تو صرف خواب و خیال تھا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ورنہ خود خواب کی حالت میں وہ خواب ایک حقیقت ہوتا ہے خیال و وہم نہیں ہوتا۔ اسی طرح دنیاوی زندگی اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے لیکن اخروی زندگی کے مقابلے میں صرف خواب و خیال ہی کی حیثیت ہے بلکہ ویسے بحقیقت یوم البعث ملنے والے ثواب یا عذاب کا برزخ ایک حصہ ہے بلکہ برزخ ایک ایسا جھروکہ ہے جس سے انسان اپنا انجام کو دیکھ سکتا ہے ۔

برزخ کے سلسلے میں بکثرت ایسی روایات موجود ہیں جن میں برزخ کے اندر متقین کی حالت کو بیان کیا گیا ہے اور ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متقی حضرات برزخ میں پہنچ کر جنت میں داخل نہیں ہو جائیں گے، بلکہ ان کے سامنے جنت کا دروازہ کھول دیا جائے گا اور اس سے وہ اپنی جگہ جنت میں دیکھا کریں گے۔ اور جنت سے چلنے والی ہواؤں سے متقین کی روحیں لطف اندوز ہوں گی ۔

مرنے کے بعد اور دوسری زندگی کی ابتداء ہی میں انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے اگر دنیاوی آداب و رسوم ختم ہو چکے ہیں اور یہ بات فطری ہے کہ جب ظاہری اسباب منقطع ہو جائیں اور

ملہ : منقول از کتاب "زیست گفتار" الشہید المطہری ص ۳۲۳

انسان ایک ایسی جگہ پہنچ جائے جس کا افق دنیاوی ظواہر سے خالی ہو تو وہاں پر تمام وہ ہدف سراب میں بدل جائیں گے جس میں وہ زندگی بھر مشغول رہا تھا۔

خداوند عالم قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے: وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ ۔ وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ وَمَا نَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَكُمُ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ أَنَّهُمْ فِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَد تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ۔

(سورہ انعام آیت ۹۳، ۹۴) اور اے رسول! کاش تم دیکھتے کہ یہ ظالم موت کی سختیوں میں پڑے ہوئے ہیں اور فرشتے ان کی طرف (جان نکالنے کے واسطے) ہاتھ لپکا رہے ہیں (اور کہتے جاتے ہیں) کہ اپنی جانیں نکالو آج ہی تو تم کو رسوائی کے عذاب کی سزا دی جائے گی کیونکہ تم خدا پر ناحق جھوٹ جوڑتے تھے اور اس کی آیتوں (کے انکار) سے اکڑا کرتے تھے اور آخر تم ہمارے پاس تنہا آئے (نا) جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو (مال اولاد) ہم نے تم کو دیا تھا وہ سب اپنے پس پشت چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ان سفارش کرنے والوں کو بھی نہیں دیکھتے جنکو تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہاری پرورش (وغیرہ) میں (ہمارے) ساجھے دار ہیں۔ اب تو تمہارے باہمی تعلقات منقطع ہو گئے اور جو کچھ تم خیال کرتے تھے وہ سب تم سے غائب ہو گیا۔

دنیاوی زندگی میں انسان دو مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔

۱۔ انسان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کی تمام متاع کا مالک ہے اور انہیں چیزوں کے ذریعے وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے۔

۲۔ انسان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ ان چیزوں کی مدد کے بغیر وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے پر قادر

نہیں ہو سکتا اور دوستوں، رشتہ داروں، صاحبانِ اثر و نفوذ، مشہور اشخاص کی مدد لئے بغیر اپنے مقاصد کے حصول سے عاجز ہے۔

اور اسی لئے قرآن نے ان دونوں چیزوں کے زوال و بطلان کی طرف کافی سے زیادہ طریقہ سے متوجہ کیا ہے۔ چنانچہ انسان مرتے وقت تمام مادی وسائل اور خیالی معبودوں سے رشتہ توڑ لیتا ہے اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب اس کی آنکھیں حقیقت کو دیکھنے پر آمادہ ہوتی ہیں، اور جن چیزوں کو وہ بہت ہی قیمتی سمجھ رہا تھا ان کی بے قیمتی کا احساس ہونے لگتا ہے ———

اور انسان کی اس وقت شدید خواہش یہ ہوتی ہے کہ کاش وہ اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو ان باتوں سے ڈرا سکتا جن سے اب تک وہ دو چار ہو رہے ہیں اور انکو ایسے اعمال سے روک سکتا جن کا انہوں نے ارتکاب کیا ہے تاکہ وہ لوگ شقاوت کی بھنور اور ابدی بدبختی میں گرفتار نہ ہوں۔

روایت ہے کہ حضور سرورِ کائنات نے فرمایا: جب میت کو تابوت میں رکھ کر اٹھاتے ہیں۔ تو اس کی روح تابوت کے اوپر سے چیختی ہے: اے میرے اہل و عیال! خبردار کہیں میری طرح تمہیں بھی دنیا اپنے جال میں نہ پھانس لے کہ جس طرح حلال و حرام طریقہ سے میں نے مال جمع کیا اور اس کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر جا رہا ہوں (تم ایسا نہ کرنا کیونکہ مال کا فائدہ دوسروں کو حاصل ہوگا اور اس کا عذاب میرے لئے ہوگا۔ لہٰذا مجھے دیکھ کر اپنے کو بچاؤ) [۱]

امام علی النقی الہادی دنیا کو بازار سے تشبیہ دیتے ہیں: دنیا ایک قسم کا بازار ہے جس میں کچھ لوگوں کو نفع اور کچھ کو نقصان حاصل ہوتا ہے۔ [۲]

قرآن لوگوں کو دنیا کے بازار میں نفع بخش تجارت پر آمادہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] بحار ج ۳، چاپ قدیم ص ۱۳۶
[۲] تحف العقول ص ۵۱۲

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (س الصف آیت ۱۰، ۱۱) اے ایماندارو کیا میں تمہیں ایسی تجارت نہ بتا دوں جو تم کو (آخرت کے) دردناک عذاب سے بچا دے (وہ یہ ہے کہ) خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اپنے مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کرو۔ اگر تم سمجھو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اعمال کے ترازو

قیامت کے دن ہمارے اعمال کس ترازو پر تولے جائیں گے؟

یہ بات ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ جو چیزیں ہماری دنیاوی زندگی کے تجربے میں کبھی نہ آئی ہوں اگر ہم ان کا ذہنی تصور بنانا چاہیں تو وہ تصور محض خیالی ہوگی اس کا حقیقت سے کوئی لگاؤ نہ ہوگا بلکہ انسانی توقع پیچ ہوگی اور ادراک حقیقت کے لئے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا سکے گی۔

اسی لئے یہ ایک بیکار سی بات ہے کہ ہم اپنے ذہنوں سے ایسی چیز کا انتظار کریں کہ وہ ہمارے سامنے آخروی زندگی کی تصویر اور اس کی خصوصیات کو مجسم کرکے پیش کردے۔ ہم اس دنیاوی قید میں ہیں ہمارے اور آخرت کے درمیان ایک حد فاصل ہے اس لئے ہم اس زندگی کی مکمل گہرائی اور عظمت کا احاطہ اور اس کی حقیقت تک کسی طرح رسائی نہیں حاصل کرسکتے۔ اور کسی غیر مستقر اور متغیر موجود سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہمارے لئے حیات ابدی کی حقیقی صفات بیان کردے گا، حماقت اور خام خیالی غلط ہے۔

لہٰذا اگر قیامت کے دن لوگوں کے حساب وکتاب اور فیصلہ کے بارے میں گفتگو ہو اور ہم یہ سوچنے لگیں کہ وہاں بھی حساب ترازو میں اور دنیاوی نظام کے مطابق تحقیق وتفتیش کے بعد حکم صادر کیا جائے گا تو یہ ہماری کوتاہی وغلطی ہوگی اور اس سلسلے میں جو بھی تصویر کشی کی جائے گی وہ حقیقت سے کوسوں دور ہوگی۔

حقیقت کے متلاشی اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جب ایسے عالم کی گفتگو ہو رہی ہو جو ہماری دنیا سے من جمیع الجہات الگ تھلگ ہو تو اس جگہ حساب کی کیفیت اور اچھے برے کی تمیز کرنے کے لئے یہ سوچنا کہ لوگ اس ملک کے افسروں کے سامنے کھڑے ہوں گے اور اس کے

بعد ان کے اعمال بہت بڑی اور سوئی ترازو میں تولے جائیں گے اور رد و قدح کے بعد ملک کے لئے
آخری حکم صادر ہوگا اور پھر متعلقہ افسروں سے اس کے نفاذ کے لئے کہا جائے گا" وہاں یہ صورت
نہیں ہوتی بلکہ قرآن اس میزان کے لئے ایک جامع مفہوم بیان کرتا ہے: وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَ
وَضَعَ الْمِيزَانَ (سورہ رحمان آیت ۷) اور اسی نے آسمان بلند کیا اور ترازو (انصاف) کو قائم کیا۔
دوسری جگہ ارشاد ہے: وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ
شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَى بِنَا حَاسِبِينَ ۔
(سورہ انبیاء آیت ۴۷) اور قیامت کے دن ہم (بندوں کے بھلے برے اعمال تولنے کیلئے)
انصاف کے ترازو قائم کر دیں گے تو پھر کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانے
کے برابر کسی کا عمل ہوگا تو ہم اسے لا حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کے واسطے بہت کافی ہیں
ایک اور جگہ ارشاد ہے: وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا
أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ (سورہ اعراف آیت ۸، ۹) اور اس دن (اعمال
کا) تولا جانا بالکل ٹھیک ہے۔ پھر تو جن کے (نیک اعمال کے) پلے بھاری ہوں گے تو وہی لوگ
فائز المرام ہوں گے اور جن کے (نیک اعمال کے) پلے ہلکے ہوں گے تو انہی لوگوں نے ہماری آیات سے
نافرمانی کرنے کی وجہ سے یقیناً اپنا نقصان کیا ——

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے اصالۃ الوجود کو گم کر دیا
وہ ایسے گھاٹے میں پڑ گئے جس کا پورا کرنا ممکن نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس شخص کے
اصل وجود انسان ختم ہو جائے وہ شخص اتنا بڑا خسارہ ہے کہ کوئی بھی شے اس کی جگہ کو پُر نہیں کر سکتی
یہاں اس نکتہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے کہ حیثیت الفاظ کے معانی سمجھنے کے لئے موجود
مصادیق ہی معیار نہیں ہوا کرتے بلکہ مفاہیم کو نتیجہ کے اعتبار سے سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اور

آخرت کے لئے جن مفاہیم کو استعمال کرتے ہیں ان کے لئے ہمارے الفاظ و بیان میں گنجائش ہی نہیں ہے اسی لئے آخرت کے بارے میں ہم جو کلام کرتے ہیں وہ کلام ان حقائق کی وضاحت کرنے سے بالکلیہ عاجز ہے۔

اس زمانے میں اگرچہ علمی ترقی کی برکت سے ایسے ایسے میزان ایجاد ہو گئے ہیں جن سے فضائی دباؤ، جسم کی حرارت کی مقدار، فشارِ دم، بجلی کی لہروں کی مقدار کو ناپا جا سکتا ہے لیکن ـــــ اس ترقی کے باوجود ـــــ ابھی تک کوئی ایسا آلہ نہیں ایجاد کیا جا سکا جس سے نیت کی کیفیت عمل کے حسن و قبح کی مقدار معلوم کی جا سکے، حالانکہ آخرت میں ہر شئے کے مناسب وزن کے لئے پیمانے موجود ہیں۔

آخرت میں ایسے دقیق مقیاس موجود ہیں جن سے روحانی اور معنوی چیزوں کو تولا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انسان کے اعمال کو حسن و قبح کے لحاظ سے بھی وزن کیا جا سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہیں سر دست ہم نہیں پہچانتے۔ اور اس دنیاوی زندگی میں اس کی حقیقت کا ادراک بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اس رنگ برنگی اور تغیر پذیر دنیا میں ہماری معرفت کا ذریعہ مسلسل تجربات ہیں۔ اور آخرت کے پیمانے ایسے ہیں جن کا نہ ہم ڈائریکٹ ادراک کر سکتے ہیں اور نہ ہی ہمارا حدس صائب وہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے اس دنیا میں اس کا تجربہ ہمارے لئے محال ہے۔

ہشام نے امام صادقؑ سے ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئاً کے معنی پوچھے تو حضرتؑ نے فرمایا: موازین سے مراد انبیاء اور اوصیاء ہیں۔ اس روایت کے مضمون کو اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ جو حضرات انسانیت میں کامل ہیں ـــــ اور یہ صرف انبیاء اور ائمہ ہی ہیں متّرجم ـــــ وہی حضرات لوگوں کے اعمال کی قیمت جانچنے کے مضبوط میزان اور دقیق مقیاس ہیں۔ اور ہر شخص اپنے ایمان و عمل کی قیمت کو ان حضرات کے ایمان و عمل کی نسبت کی مقدار سے جانچ سکتا ہے۔

بلکہ متقی اور صالح حضرات ہماری اس دنیا میں بھی معیار ہیں، لیکن چونکہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں کہ جو اس دنیا میں مبہم ہیں تو وہ قیامت میں واضح ہو جائیں گی کیونکہ حقائق اس دن منکشف ہونگے ـــــــ آیت میں "موازین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے بظاہر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اولیاء خدا متعدد ہیں اور انسانیت کے رہبر متعدد ہیں اور یہی قیامت کے میزان ہیں۔

بہت سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ عمل کی قیمت کا دارو مدار اس میں موجود منافع پر ہے اسی لئے یہ لوگ اس عمل کو بہت اہم سمجھتے ہیں جس میں فائدہ بہت زیادہ ہو حالانکہ یہ قاعدہ عمل کی اجتماعی اور خارجی قیمت پر تو یقیناً منطبق ہو سکتا ہے مگر اس فاعل کی نیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ یہ قاعدہ اس فاعل پر بھی منطبق ہے کہ جو عمل خیر ریاکاری اور لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانے کے لئے کرنا چاہتا ہو۔ اور اس فاعل پر بھی منطبق ہوتا ہے جس نے خلوص نیت اور قربۃً الی اللہ عمل خیر انجام دیا ہو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اجتماعی نظام میں عمل خیر کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے معاشرہ کو فائدہ حاصل ہو چاہے عمل کسی بھی نیت سے کیا گیا ہو۔ اور اس کا کوئی بھی مقصد ہو اور کسی بھی فکری نظام کے تحت کیا گیا ہو۔ لیکن آفاق الٰہی میں مقدار عمل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ وہاں سارا دارو مدار نیت اور ضمیر اور غرض فاعل پر مبنی ہوتا ہے۔ پس قیاس واقعی کا ملاک اور جس کو خدا قبول کرتا ہے وہ عمل کی کیفیت اور اس کا محرک ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص ایسا عمل کرے جو روح حقیقت سے خالی ہو، قربۃً الی اللہ کا دور دور سوال نہ ہو سستی شہرت اور ریاکاری اور لوگوں کی نظروں میں محترم ہونے کی وجہ سے ہو، تو صرف یہی نہیں کہ وہ عمل درجہ قبولیت تک نہیں پہنچتا بلکہ اس کی واقعی قیمت بھی بہت گر جاتی ہے۔ ان مقاصد کے لئے کئے گئے عمل کی مثال اس جسم کی سی ہے جس میں روح نہ ہو اس کی کوئی قیمت ہو۔ اور اس قسم کے عمل کی قیمت خدا کے نزدیک اس لئے کچھ نہیں ہوتی کہ اس نے اپنے دین کو دنیا سے بیچ دیا۔ لہٰذا

نظرِ قدرت میں مہربانی و رحم کا مستحق نہیں ہے۔

پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ کسی بھی عمل کی قیمت صرف معاشرہ کے لئے نفع کی بنیاد پر نہیں رکھی جا سکتی اور نہ ہی عمل کی قیمت لگانے میں معادلات ریاضیہ پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ہاں اگر کسی عمل میں خصوصیت ہو اور کمال معنوی کا اس میں تحقق ہو اور ملکوتی صورت کا حامل ہو اور روح نے خواہشِ نفس کے تنگ قفس کو توڑ دیا ہو اور خلوص و صفاء کی اعلیٰ منزل پر فائز ہو اور انسان نے کسی قید و شرط کے بغیر صرف حکم خدا کی خاطر انجام دیا ہو تو ایسا عمل واقعاً خدا کے لئے ہوتا ہے، اور اس کی ادائیگی میں حقیقی بھی زحمت و پریشانی اس نے اٹھائی ہے وہ چونکہ صرف خدا کے لیے ہے اس لئے اس کا ثواب بھی خدا ہی پر ہے۔

انسان کے ترقیٔ درجات اور قبولیتِ عمل کے سلسلے میں بنیادی چیز ہدفِ خالص اور ایسی پاکیزہ نیت ہے جس کا مقصد محض رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ پس ہر انسان کے عمل کی قیمت اس کے خلوص پر موقوف ہے۔ سرکار رسالتمآبؐ فرماتے ہیں: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ عمل کا دارومدار نیت پر ہے (نہج الفصاحۃ ج ۱ ص ۱۹۰) اس آیت لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورۂ ملک آیت ۲) "تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کام میں سب سے اچھا کون ہے" کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: اس سے زیادہ عمل کرنا مراد نہیں ہے بلکہ صحیح عمل کرنا مراد ہے اور صحیح عمل کا مطلب خوفِ خدا اور نیک نیت ہے اس کے بعد فرمایا: عمل پر باقی رہنا یہاں تک کہ وہ خالص ہو جائے نفسِ عمل سے زیادہ مشکل ہے۔ اور عمل خالص کا مطلب یہ ہے تم خدا کے علاوہ کسی اور سے مدح کے خواہشمند نہ ہو اور نیت عمل سے بہتر ہے بلکہ آگاہ ہو کہ نیت ہی عمل ہے پھر اس آیت کی تلاوت فرمائی: قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ (سورۂ اسراء[1] آیت ۸۴) (اصول

---

[1] سورۂ اسراء سے مراد سورۂ بنی اسرائیل ہے: مترجم

تم کہہ دو کہ ہر ایک اپنے (اپنے) طریقہ پر عمل کرتا ہے۔ معصوم نے فرمایا شاکلتہ کا مطلب علیٰ نیتہ ہے۔[1]

ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کے نزدیک عمل کی قبولیت و عدم قبولیت کا دارومدار فقط انسانِ عامل کی روح ہے وہی روحِ عمل جس کا احساس انسان کو عمل کے درمیان ہوتا ہے اور خدا بھی اس کا عالم ہے خدا کے نزدیک یہی روحِ عمل میزانِ اعمال ہے۔ اور اسی میزان کا تعارف خاصانِ خدا نے لوگوں کو کرایا ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ محض خوشنودی خدا کے کسی اور مقصد کے لئے عمل خیر کو انجام نہ دیا جائے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (سورہ بقرہ آیت ۲۶۵) اور جو لوگ خدا کی خوشنودی کے لئے اپنے دلی اعتقاد سے اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس (ہرے بھرے) باغ کی سی ہے جو کسی ٹیلے یا ٹیکرے پر لگا ہوا ہو اور اس پر زور و شور سے پانی برسے تو اپنے دگنے پھل لائے اور اگر اس پر بڑے دھڑے کا پانی نہ بھی برسے تو اس کے لئے ہلکی پھوار (ہی کافی) ہے اور جو کچھ تم کرتے رہتے ہو خدا اس کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے۔

انسان کا ایمان و اعتقاد خدا پر جتنا زیادہ اور قوی ہوتا جاتا ہے اس کے اعمال میں اس کی علامات اور آثار بھرپور وضاحت کے ساتھ خلوص پر دلالت کرنے لگتے ہیں اور اسی کے طفیل میں اس کی تمام خواہشات اور امیدوں پر رضائے الٰہی کی چھاپ ہوتی ہے۔

چنانچہ آپ ملاحظہ فرمایئے جناب سلیمان نے جب خدا سے دعا کی تھی تو ان کی دعا کو خدا نے قرآن

---

[1] اصول کافی۔ ج ۳ ص ۲۹ باب الاخلاص

میں نقل کیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سلیمان کا عمل رضائے الٰہی کے لئے ہوا کرتا تھا، ارشاد ہے: رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ (سورۂ نمل آیت ۱۹) جناب سلیمان نے عرض کی: پروردگارا مجھے توفیق عطا فرما کہ جیسی جیسی نعمتیں تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر نازل فرمائی ہیں میں (ان کا) شکریہ ادا کروں اور میں ایسے نیک کام کروں جن سے تو راضی ہو۔ اسی طرح جناب یوسفؑ حساس ترین لمحات میں امر الٰہی کی اطاعت کی طرف اور حفظ طہارت کی خاطر خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور خواہشات نفسانی کی پیروی اور معصیت الٰہی پر قید کو ترجیح دیتے ہیں اور عرض کرتے ہیں: رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (سورۂ یوسف آیت ۳۳) یوسف نے عرض کی اے میرے پالنے والے جس بات کی یہ عورتیں مجھ سے خواہش رکھتی ہیں اس کی نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ جناب یوسفؑ نے اس آزادی اور حریت سے جو امر الٰہی کی نافرمانی پر آمادہ کرتی تھی بڑی شدت کے ساتھ اعراض کیا اور طہارتِ ذات اور آزادیٔ روح کی خاطر مطمئن ہو کر قید کو پسند فرمایا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

اور بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ خوفِ عقاب اور طمعِ ثواب کے بغیر اوامر الٰہی کی اطاعت کرنا معیار خلوص ہے اور یہ بات صرف ان صادقین کے لئے مخصوص ہے جن کی تربیت الٰہی ہاتھوں نے کی ہو اور آسمانی تربیت کی نگرانی رہی ہو، تو یہ حضرات معرفت ذات الٰہی اور خلوص کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں اور ان کے پیش نظر مرضیٔ الٰہی کے علاوہ کچھ ہوتا ہی نہیں اور ایسے حضرات صرف وہی اعمال بجالاتے ہیں جو مراد خدا اور مامور بہ ہوا کرتا ہے۔

حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ کے اندر اس قسم کے لوگوں کو "احرار" سے تعبیر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں: کچھ لوگ خدا کی عبادت طمع (جنت) کی خاطر کرتے ہیں اور یہ تاجروں جیسی عبادت ہے اور کچھ لوگ خوف (دوزخ) کی وجہ سے خدا کی عبادت کرتے ہیں اور یہ غلاموں کی عبادت

ہے۔ البتہ کچھ لوگ خدا کی عبادت اس کی نعمتوں پر بطور شکریہ کرتے ہیں اور یہ احرار کی عبادت ہے۔[1]

ایک اعتبار سے خدا کی عبادت ایک ایسی عمومی شے ہے جو پورے عالم کو شامل ہے اور ہر وجود اپنے حدود کے اندر عالم وجود میں عبادت کرتا ہے اور اپنے مخصوص طریقے سے خدا کا شکر اور اس کی تسبیح بجالاتا ہے اور اپنے مخصوص مدار تکامل میں حرکت کرتا ہے۔

اور دوسرے اعتبار سے چونکہ انسان اس کائنات کا ایک جزء لاینجزی ہے بلکہ عالم کا کامل جزء ہے اسی لئے اس کا جسم وجود سے منقطع ہونا منجر بہ سقوط ہوتا ہے۔ اسی لئے اس کو بھی اس عالم قانون سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اور اس کو بھی اپنی مخصوص عبادت کرنی چاہیئے تاکہ اس کے تمام علائقے خدائی رنگ میں ہوں۔

اور جب انسان اپنے لئے یہ گہرا ارتباط پیدا کرلے تو پھر اس کی شخصیت توحیدی بن جاتی ہے اور وہ صراط مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے اور اس کے تمام ابعاد وجود میں ایک تلازم وارتباط پیدا ہو جاتا ہے اور اس دنیا میں اور آخرت میں اس کے لئے فلاح و نجاح کے دروازے کھل جاتے ہیں

پس نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی عمل اس وقت تک واقع میں خیر اور ثواب اخروی کا مستحق نہیں ہوتا جب تک اس کا سبب باطنی دافع اور مقدس وجہ نہ ہو اور جب تک انسان اپنی گہری فکر سے بہرہ بردار نہ ہو اور بلند تصور سے استفادہ نہ کرے جو وسعت عالم سے مناسبت بھی رکھتا ہو اس وقت ثواب اخروی کا مستحق نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ محدود و جامد قوالب کے اندر وسعت عالم کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا ـــــ اور یہ بلند و برتر ادراک اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کی زندگی پروردگار عالم کے دائمی ارتباط کے سایہ میں پروان نہ چڑھے اور جب انسان مسلسل

---

[1] شرح نہج البلاغہ، از ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۵۱۰

عبادت الٰہی میں مشغول رہتا ہے اور پابندی سے رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے حریص رہتا ہے اور سایۂ لطف الٰہی میں زندگی بسر کرتا ہے تب وہ زمین میں خلافت الٰہی کے منصب کا اہل ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں مولائے کائنات کا تضرع الی اللہ ملاحظہ فرمایئے: اے میرے پروردگار! میں تجھ سے تیرے حق کا واسطہ دے کر اور تجھ سے تیری قدوسیت کا واسطہ دے کر تیری بڑی سے بڑی صفت اور بڑے سے بڑے نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ میرے رات اور دن کے اوقات اپنی یاد سے معمور کر دے، اپنی خدمت میں لگے رہنے کی دھن لگا دے، اور میرے اعمال کو اپنے حضور میں قبول فرما تاکہ میرے کل اعمال اور میرے کل وظائف کی ایک ہی ورد ہو جائے اور مجھے تیری خدمت کرنے میں دوام حاصل ہو جائے۔ اے میرے سردار! اے وہ جس کا مجھے آسرا ہے اور جس کی حضور میں اپنی پر حالت کی شکایت پیش کرتا ہوں، اے میرے پروردگار! اے میرے پالنے والے! اے میرے مالک! میرے ہاتھ پاؤں کو اپنی خدمت کے لئے مضبوط کر دے اور احسن ارادے کے لئے میرے قلب کو مضبوط کر دے اور مجھے توفیق عطا فرما کہ تجھ سے ڈرتا رہوں اور ہمیشہ تیری خدمت میں لگا رہوں تاکہ سبقت کرنے والوں کے میدانوں میں تیری حضوری حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھتا رہوں اور تیری خدمت میں پہنچنے کے لئے جلدی کرنے والوں میں تیز تیز چلتا رہوں اور تیرا قرب حاصل کرنے کا اشتیاق رکھنے والوں کا سا شوق مجھے بھی حاصل رہے اور تیری جناب میں اخلاص رکھنے والوں کی سی نزدیکی مجھے بھی حاصل ہو جائے اور تیری ذات والا صفات پر یقین والوں کی طرح ڈرتا رہوں اور تیرے حضور میں ایمان رکھنے والوں کے ساتھ مجھے بھی مل جانے کا موقع میسر آسکے۔

اعمال کے سچے گواہ

قرآن مجید اس بات کو صراحت سے بیان کرتا ہے کہ محکمۂ عدل الٰہی میں مجرمین کے خلاف گواہی دینے والے ہر لحاظ سے دنیاوی گواہوں سے الگ ہیں اور اس دار فانی میں محکمے جس طرح تحقیق و تفتیش کرتے ہیں۔ اس کی تشبیہ کسی بھی طرح عالم آخرت سے دی ہی نہیں جا سکتی۔

یوم البعث کے گواہوں کا جب قرآن تذکرہ کرتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اس دن مجرمین کے ہاتھ، پاؤں، اعضاء و جوارح، بدنوں کی کھالیں تک گواہی دیں گی اور یہ گواہ انسانوں کے رازوں پر پڑے ہوئے پردے اٹھا دیں گے۔ اور تمام وہ برے کام جن کو زندگی بھر مجرمین کیا کرتے تھے اور جن کا علم خدا کے علاوہ کسی کو نہیں تھا ان سب کے پردے چاک کر دیئے جائیں گے۔

یوم البعث اعضاء و جوارح میں دوبارہ زندگی کا پیدا ہونا اور ان اعضاء کا دنیاوی زندگی میں ہوئے تمام واقعات کی گواہی دینا واضح دلیل ہے کہ ہمارے تمام اعمال ایک ایک کر کے عالم خارج میں اور ہمارے ابدان کے اعضاء مختلف میں اور ایک نظام دوسرے نظام میں جہاں اس دنیا کے ظروف ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے ظروف آ جاتے ہیں ان میں مسجل و محفوظ کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ قرآن مجید اس دن کی صفت بیان کر رہا ہے: یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِرُ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّ لَا نَاصِرٍ۔ (س طارق، آیت ۹، ۱۰) جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو اس دن اس کا نہ کچھ زور چلے گا اور نہ کوئی مددگار ہوگا۔

جو اعمال محفوظ ہیں ان کو پیش کیا جائے گا اور گواہی شروع ہو جائے گی۔ اور اعضاء کی گواہی کوئی عجوبہ اور عجیب چیز نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے اندر اعضاء کی گواہی کے نمونے موجود ہیں، مثلاً تجربہ کار طبیب جسم کی زبان سمجھ لیتا ہے، نبض پر ہاتھ رکھتے ہی اگر اس کی سرعت کا احساس ہو جاتا

ہے تو طبیب فوراً بخار کا حکم لگا دیتا ہے۔ آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی زردی کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ اس کو پیلیا ہو گیا ہے۔ ہم لوگ بھی درخت کے چھالوں کی تہہ دیکھ کر درخت کی عمر بتا سکتے ہیں۔

البتہ یہ بات درست ہے کہ ہم کو یہ نہیں معلوم کہ قیامت کے دن گواہیوں کا طور اور ان کی کیفیت کیا ہو گی! لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بہر حال معلوم ہے کہ اس دن لوگوں کی نظروں کے سامنے سے پردے اٹھ جائیں گے اور وہ اپنے اردگرد کی بہت سی ان چیزوں کا خود مشاہدہ کریں گے جن سے دنیا میں غافل تھے اور اس کی تصدیق قرآن کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے: لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (سورۂ ق، آیت ۲۲)

یقیناً تو اس دن سے غافل تھا — ہم نے تیرے سامنے سے پردہ ہٹا دیا تو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے

اب ہم بعض ان آیات کا تذکرہ کر رہے ہیں جن میں بعض گواہوں کا تذکرہ موجود ہے:

وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوزَعُونَ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (سورۂ فصلت[1] آیت ۱۹ تا ۲۳)

اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہنکائے جائیں گے تو یہ لوگ ترتیب وار کھڑے کیے جائیں گے

---

[1] اس سورہ کو حم السجدہ بھی کہا جاتا ہے۔ مترجم

یہاں تک کہ جب سب کے سب جہنم کے پاس جائیں گے تو اُن کے کان ان کی آنکھیں اور ان کے گوشت و پوست ان کے خلاف اُن کے مقابلہ میں ان کی کارستانیوں کی گواہی دیں گے اور یہ لوگ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟ تو وہ جواب دیں گے کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی (اپنی قدرت کاملہ سے) گویا کیا اور اسی نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اور (آخر) اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔ اور (تمہاری تو یہ حالت تھی کہ) تم لوگ اس خیال سے (اپنے گناہوں کی) پردہ داری بھی تو نہیں کرتے تھے کہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے اعضاء تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ بلکہ تم تو اس خیال میں (الجھے ہوئے) تھے کہ خدا کو تمہارے بہت سے کاموں کی خبر ہی نہیں ہے اور تمہاری اسی بدخیالی نے جو تم اپنے پروردگار کے بارے میں رکھتے تھے۔ تمہیں تباہ کر ڈالا جس کے نتیجے میں تم گھاٹے میں رہے۔

اسی طرح سورہ نور آیت ۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے، يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ، جس دن اُن کے خلاف ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کی کارستانیوں کی گواہی دیں گے۔

یہ آیات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ گنہگاروں نے جن اعضاء سے گناہوں کا ارتکاب کیا ہے ان سے اپنے گناہوں کو چھپا نہیں سکیں گے اور اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے ان اجسام مادی کی طرف جو ان کے تصرف میں ہیں ملتفت نہیں تھے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خیال کرتے تھے کہ یہ اشیاء مستقل بالذات ہیں اور ان کے اعمال کا علم خدا کو نہیں ہے اور اس حقیقت واقعی سے ــــ کہ خدا سے عالم وجود کی کوئی چیز چھپی نہیں ہے ــــ غفلت نے ان کو شقاوت و بلا میں گرفتار کیا۔

قرآن ایک جگہ اور خبر دیتا ہے: اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ، (س یٰس، آیت ۶۵)

آج ہم ان کے دہنوں پر مہر لگا دیں گے اور جو (جو) کارستانیاں یہ لوگ (دنیا میں) کر رہے تھے خود ان کے ہاتھ ہم کو بتا دیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔

امام جعفر صادق ؑ اس موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، جب قیامت کے دن خدا تمام بندوں کو جمع کرے گا اور ہر ایک کا نامۂ اعمال اس کے سپرد کر دیا جائے گا تو لوگ جب اسے دیکھیں گے تو ان تمام اعمال کا انکار کر دیں گے تو ملائکہ گواہی دیں گے یا لکھنے والے انہوں نے اعمال کئے ہیں تو یہ بندے قسم کھائیں گے کہ ہم نے تو یہ سب کیا ہی نہیں اور خود قرآن نے اس کی خبر دی ہے۔ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۔ (س مجادلہ آیت ۱۸) جس دن خدا ان سب کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا تو یہ لوگ جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اسی طرح خدا کے سامنے بھی قسمیں کھائیں گے اور خیال کرتے ہیں کہ وہ راہِ صواب پر ہیں، آگاہ ہو یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں ——— اور جب یہ لوگ قسم کھانے لگیں گے تو خدا ان کے دہنوں پر مہر لگا دے گا اور اعضاء ان کی کارستانیوں کی گواہی دینے لگیں گے، [1]

بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہوگی کہ خود عمل مجسّم ہو کر انسان کی نظروں کے سامنے آجائے گا اور انسان متحیر ہو جائے گا اور یہ اتنی بڑی گواہی ہوگی کہ انسان نہ کوئی دعویٰ کر سکے گا اور نہ دفاع کی کوئی گنجائش اس کے لئے باقی رہے گی اور عذاب سے بچنے کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ (یہی نہیں) بلکہ مجرم سے انکار کی قدرت، جھوٹ کی قوت، لفظوں کی الٹ پھیر کی قدرت سب چھین لی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آخرت میں کوئی جرم ثابت نہ ہو سکنے کی

---

[1]: تفسیر علی بن ابراہیم قمی چاپ قدیم ص ۵۵۲

کی وجہ سے چھپنڈ جنگ میں نہیں ڈالا جا سکتا اور وہاں پر مجرمین کی وہ رسوائی ہوگی کہ خدا کی پناہ۔
چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا۔ (س کہف، آیت ۴۹) اور جو کچھ ان لوگوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب موجود پائیں گے، اسی طرح ایک اور جگہ پر ہے: يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ۔ (س آل عمران آیت ۳۰) (اور اس دن کو یاد رکھو) جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے (دنیا میں) نیکی کی ہے اور جو کچھ برائی کی ہے اس کو موجود پائے گا (اور) آرزو کرے گا کہ کاش! اس کی بدی اور اس کے درمیان میں زمانۂ دراز (حائل) ہو جاتا اور خدا تم کو اپنے ہی سے ڈراتا ہے اور خدا (اپنے) بندوں پر بڑا شفیق (و مہربان بھی) ہے۔

چونکہ آخرت میں کسی بھی شکل میں عمل کا فوت ہونا ممکن نہیں ہے لہٰذا مجرمین کی خواہش ہوگی کہ کاش! ان کے اور ان کے اعمال میں زمانۂ دراز حائل ہوتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود انسان اس دن اپنے عمل سے کس قدر متنفر ہوگا اور اس کی وجہ ہے کہ بُعدِ زمانی کبھی زیادہ بہ نسبت فاصلہ مکانی کے نفرت پر دلالت کرتا ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ خود خدا اپنے کو لوگوں کے اعمال کا گواہ بتاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ (س آل عمران آیت ۹۸) تم لوگ خدا کی نشانیوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ خود خدا تمہارے اعمال کا شاہد ہے۔
اسی طرح قرآن انبیائے کرام اور مقربین کو بھی لوگوں کے اعمال پر گواہ کی حیثیت سے کراتا ہے ارشاد ہوتا ہے: وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الْكِتَابُ وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ۔

(سورہ الزمر آیت ۶۹) اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور اعمال کی کتاب (لوگوں کے سامنے) رکھ دی جائے گی اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ذرہ برابر) ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک اور بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اعمال کی گواہی صرف اس کے ظاہری شکل پر محدود نہ ہوگی۔ بلکہ حسن و قبح، اطاعت و عصیان کی حیثیت سے کیفیتِ عمل کی بھی گواہی ہوگی یعنی باطنی اعمال کی گواہی ہوگی۔

قیامت کے دن کی گواہی" اس بات کے ساتھ ساتھ کہ اس میں گواہ کا احترام و اکرام کیا گیا ایسے شخص کی طرف سے ہوگی جو دنیاوی زندگی میں دل کے بھیدوں سے واقف تھا اور انسان کی گہرائیوں تک نفوذ کئے ہوئے تھا۔ اور جس نے لوگوں کے اعمال کو کسی خطا و اشتباہ کے بغیر محفوظ رکھا تھا اور جب ایسا ہے تو پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اس قسم کی گواہی عادی معلومات اور حواس ظاہری کی بنیاد پر نہ ہوگی بلکہ اس کے لئے ایسی معلومات ہونی چاہئیں جو اس سے بلند و بالا ہوں اور ایسی گہری نظر رکھنے والا گواہ ہونا چاہیئے جو لوگوں کے باطن اور دل کے بھیدوں سے واقف ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات عادی قوتوں کے ماوراء سے متعلق ہو سکتی ہے کہ جس کے ذریعے عمل کی گہرائیوں تک پہنچا جا سکے اور صالح و غیر صالح میں تمیز دے سکے، ظاہر ہے کہ ایسی گواہی جو عین واقع ہو دیکھ کر ہی ہو سکتی ہے اور ہر قسم کی خطائے سے پاک ہو کر ہی دی جا سکتی ہے۔

قرآن مجید اس سلسلے میں اعلان کرتا ہے: وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (سورہ توبہ آیت ۱۰۵) (اے رسولؐ کہدو کہ تم لوگ اپنے اپنے کام کئے جاؤ ابھی تو خدا اور اس کا رسولؐ اور مومنین تمہارے کاموں کو دیکھیں گے اور بہت جلد (قیامت میں) ظاہر و باطن کے جاننے والے (خدا) کی طرف لوٹا دیئے جاؤ گے تب

وہ جو کچھ بھی تم کرتے تھے تمہیں بتا دے گا۔

اس آیت میں ــــــ حسبِ تفسیر ــــــ مومنین سے مراد ائمہ معصومین ؑ ہیں جو تمام متقین سے متمیز ہیں اور خدا کے خاص لطف وعنایت کے مورد ہیں اور یہ پاک وپاکیزہ ہیں اسی لئے منصب شہادت کو تمام متقین سے متعلق نہیں کیا گیا۔

مناقب میں امام محمد باقر ؑ سے تقریباً یہی مطلب منقول ہے کہ حضرت نے فرمایا: لوگوں پر گواہ ائمہ اور رسول کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ رہا امت کا مسئلہ تو خدا امت کو گواہ بنا ہی نہیں سکتا کیونکہ امت میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جن کی گواہی ایک گٹھی سبزی پر بھی مقبول نہیں ہے۔[۱] تو پھر لوگوں کے اعمال کے گواہ امت کیونکر ہو سکتی ہے؟

انسان کا کوئی بھی عمل ہو اس کا بہت ہی گہرا اثر انسان کے وجود پر مرتب ہوتا ہے، مثلاً جو شخص یہ جانتا ہے کہ ظلم وجرم فساد ہیں لیکن خواہشِ نفسانی کے غلبہ کی وجہ سے وہ اس کا ارتکاب کر ڈالتا ہے تو باطنی عالم میں اس کے ایک زبردست جنگ برپا ہو جاتی ہے اور اس کے اخلاق انقلاب کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اب خود ہی سوچئے کہ خود انسان کے علاوہ اس کے باطن میں یہ جنگ کس نے برپا کی؟

حسد انسان کے دل کو کھا لیتا ہے تو کیا اس کی علت خود انسان کے علاوہ کوئی اور ہے؟ نہیں ہرگز نہیں!

امام جعفر صادق ؑ فرماتے ہیں: جس طرح چھری گوشت کے اندر پیوست ہوتی چلی جاتی ہے برائی اس سے کہیں زیادہ انسان کے اندر اثر کرتی ہے۔[۲]

۱۔ تفسیر المیزان۔ جلد ۱ ص ۳۳۲

۲۔ البحار۔ جلد ۷۳، ص ۳۵۸

خلاصۂ بحث یہ ہوا کہ ہمارے تمام اعمال و اقوال مسجل و محفوظ کئے جاتے ہیں اور وہ ہمارے اجسام و ارواح میں جاری و ساری ہوتے ہیں پھر قیامت کے دن مجسم ہو کر ظہور پذیر ہوتے ہیں پس ہمارے تمام آثار ــــــ اچھے ہوں یا برے ــــــ ہمارے وجود میں جمع ہوتے ہیں اور قیامت میں ہمارے سامنے ظاہر ہوں گے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم آخرت کے محکمے کی تفتیش و تحقیق اور اعمال کا محاسبہ بالکل نئے طریقہ سے ہوگا، جہاں پر حقیقت کے پوشیدہ ہو جانے کا ذرہ برابر امکان نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی فرد اس کا انکار کر سکے گا، بلکہ وہ حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہوگا اور واقع کے سامنے سرنگوں ہونا پڑے گا۔

جب محشر میں انسان کے ہاتھ، پاؤں، جلد وغیرہ اس کے خلاف ہوں گے اور خدا ــــــ یعنی وہ ذات جس سے آسمان و زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ درختوں کے پتوں کے گرنے کی آواز کو جانتا ہے ــــــ اور انبیاء، اولیاء ہمارے اعمال کے گواہ ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ہمارے لئے محکمۂ عدل الٰہی کے مراحل کا تصور نہایت دشوار ہے اور ہیبتناک قیامت کے دن اس محکمہ کا قائم ہونا حتمی و یقینی ہے۔

قیامت کے دن اعمال کی زندگی

زمانۂ ماضی میں تجرباتی علوم کے ایکسپرٹ اس بات کا عقیدہ رکھتے تھے کہ مادہ اور طاقت کے درمیان ایک دیوار حائل ہے جس کا توڑنا ناممکن ہے لیکن نشأۃ علمی کی جدید مسلسل سعی نے آخر اس فکر کو باطل قرار دے دیا اور علماء نے اس سے عدول کر کے ایک جدید نظریہ قائم کیا کہ مادہ میں طاقت ہو جانے کی صلاحیت ہے اور آج تبدیلِ مادہ الی طاقت کا نظریہ ایک مسلم و یقینی ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ تجرباتی علوم طاقت کہ مادہ میں بدل جانے کے امکان کو بھی تسلیم کرنے لگے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ ماضی میں یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ مادہ طاقت میں بدل سکتا ہے لیکن علمی کاوشوں کی جدید مسلسل نے آج اس کو بدیہی بنا دیا۔ اسی طرح جب علم البشر مزید ترقی یافتہ ہو جائے اور آج سے زیادہ اس میں تعمق پیدا ہو جائے تو یہ سوچنا بالکل حق بجانب ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں طاقت کو مادہ میں بدلا جا سکے۔ کیونکہ کوئی دلیل تراکم قوتوں اور منتشر طاقتوں کو مجسم حالت میں ظاہر ہونے کے امکان کو نہیں روکتی۔

ہر حرکتِ انسانی خواہ وہ عملِ خیر ہو یا بد یہ سب جسمی ذخائر ہیں جو بصورتِ طاقت خرچ ہوتے ہیں۔ بلکہ وجودِ انسان سے صادر ہوئی ہر چیز ـــــ چاہے وہ عمل ہو یا قول ـــــ طاقت کی مختلف شکل اور متنوع تجلی ہوتی ہے۔ اب چاہے وہ طاقت صوتی صورت میں ہو یا میکانکی یا دونوں سے مرکب!

اب ہمارے اجسام مثلاً اس میں موادِ غذائی مصدرِ طاقت ہوتے ہیں اور احتراقِ غذا سے حرارتی طاقت پیدا ہوتی ہے اور یہی طاقت جس کی شکل متغیر ہوتی ہے مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے کبھی آہستہ و نرم گفتگو کی صورت میں اور کبھی ثقیل حرکتوں کی صورت میں!

اور ذہنی صورتوں کا ثبات اور تقاضا کی صورتیں کم از کم ہمارے اعمال کے دائمی ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور یہی صورتیں جو کبھی ذہن کے تہہ خانوں میں مدت دراز تک پڑی رہتی ہیں ان کو کسی بھی وقت باہر نکالا جا سکتا ہے اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ ہمارے جسم و روح میں مختلف آثار چھوڑ جائیں —— فرح و سرور، غصہ و غم، دل کی دھڑکن کی سرعت، چہرے کے رنگ کا بدلنا، داخلی غدودوں کا اضطراب یہ ساری چیزیں ان خیالات کے فطری آثار ہیں۔ جو ذہنی تہہ خانوں سے سطح ذہن پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اسی بناء پر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال و اقوال —— جو بصورت طاقت فضا میں منتشر ہیں —— کبھی فنا نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنی زندگی بھر جو کچھ بھی کیا ہے وہ فطرت کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں اور حافظۂ فطرت وہ چیز ہے جس کو دست قدرت نے اس طرح بنایا ہے کہ جس میں دقیق طریقہ سے تمام چیزیں اپنے جمیع مشخصات کے ساتھ محفوظ رہتی ہیں۔ اور مستقبل میں فطرت اپنی امانتوں کو صاحبان امانت تک پہنچانے کی صلاحیت پیدا کرے گی اس وقت ذخیرہ شدہ طاقتیں جدید طریقہ سے ظاہر ہوں گی اور اپنا مقصد پورا کریں گی۔

جب یہ صورت ہے تو پھر آخر اس میں کیا تعجب ہے کہ خیر و فلاح کے راستہ میں یا ظلم و فساد کے راستہ میں صرف کی ہوئی طاقتیں —— جو فضا کے عالم میں موجود ہیں —— قیامت کے دن اپنے مخصوص جسمانی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ یعنی وہ نعمت و خیرات کی صورت میں یا عذاب و الم و تکلیف کی صورت میں ظاہر ہوں گی اس میں کون سا استبعاد ہے؟

پس ہم ہی لوگ اپنے کندھوں پر بار مسئولیت اٹھائے ہوئے ہیں تو پھر ہم ہی کو اپنے اعمال و اقوال کے ان مخصوص نتائج سے دو چار ہونا پڑے گا جو ہماری حرکات کے دوام میں مؤثر ہیں خلاصہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کا کوئی بھی عمل ہو کسی نہ کسی دن اس کی جزاء اس کو ملے گی۔

بلکہ عالم وجود میں ہمارے اعمال کے تاثرات ہماری اجازت تو درکنار ہمارے علم کے بغیر محفوظ

ہو جاتے ہیں اور ان میں روز بروز نمو و ترقی ہوتی رہتی ہے جس کا تصور بھی ہمارے لئے ناممکن ہے۔

"ہمارے اعمال کے انفعالات اسی طرح ترقی کرتے رہتے ہیں" جس طرح امتداد زمانہ سے ایک چھوٹا سا بیج عظیم درخت بن جاتا ہے اور نباتات پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل نباتات کے بیجوں کو چھوٹے بڑے مختلف شکلوں کے درختوں کی صورت میں ڈھال دیتے ہیں

کتنے تعجب کی بات ہے کہ ہم اسی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی نشہ آور چیزوں کا عادی ہوتا ہے تو زندگی کے آخری لمحے تک اس کے زیر اثر رہتا ہے یہی نہیں بلکہ اس کے برے اثرات اس کی آئندہ نسلوں تک مدتِ دراز تک مرتب ہوتے ہیں تو پھر ہم کو یہ یقین نہیں آتا کہ انسان اپنے دائمی اعمال کے نتائج آخرت میں بھگتے گا خواہ وہ ثواب کی صورت میں ہو یا سزا کی؟ اور یہ کیوں ناممکن ہے کہ عمل موقت انسان کو سعید ابدی یا شقی ابدی بنا سکتا ہے؟

بہر حال اس وقت ہمارے لحاظ سے اس حقیقت کا تصور چاہے جتنا مشکل ہو لیکن بشری معرفت کا دامن جس قدر وسیع ہوتا جائے گا کسی نہ کسی حد تک یہ موضوع واضح ہو جائیگا اور اس کی دلیل وہ عجیب و غریب انکشافات ہیں جو اب تک ہو چکے ہیں۔

اور جب ہمارے علماء اور ایکسپرٹ حضرات آج گذشتگان کی آوازوں کو ریکارڈ کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں تو مزید انکشافات کی توقع بے معنی نہیں ہے اور آج جتنے بھی زندہ موجودات ہیں ان سے بعض ایسے ارتعاشات پیدا ہوتے ہیں جن سے موجوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور مٹی کے گھڑوں میں قرنوں سے موجود امواج کو دوبارہ اعادہ کی کوشش مثبت نتائج تک پہنچ چکی ہے۔ اور اس منزل میں ہے کہ قرون متمادی کے گزرنے کے بعد بھی ان گھڑوں کے بنانے والوں کی آواز کا سننا ممکن ہو چکا ہے۔ اور اس طرح گذشتگان کی آوازوں کی معرفت حاصل کی گئی ہے بلکہ ایکسپرٹ حضرات اس بات پر قادر ہو چکے ہیں کہ چوروں کی انگلیوں کی جگہ کی تصویر اس حرارت کی وجہ سے حاصل کر لیں جو چوری کے وقت ان کے جسموں سے خارج ہوئی تھی —— تو جب

اس دنیاوی زندگی میں ہمارے علماء ان جیسے امور کی تحقیق پر قادر ہو چکے ہیں تو پھر آخرت میں آخر ہمارے اعمال کے لئے ایسا ہونا کیوں ناممکن ہے؟

آج کے انسان نے دنیا کے مختلف حصوں میں ایسی رصدگاہیں نصب کر رکھی ہیں جو بہت ہی پیچیدہ ہیں اور جو دوسری کہکشاؤں سے آنے والی موجوں کو کھینچ لیتی ہیں اور بعض کی تفسیر بھی معلوم ہو جاتی ہے اور اس فن کے ماہرین اس طرح بڑی دقیق معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور متعدد رازوں کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔

خود انسانی اعمال سے ایسی موجیں ظاہر ہوتی ہیں جو فنا نہیں ہوتیں بلکہ وہ برابر باقی رہتی ہیں اور ایسے آلات کے ذریعے جن میں ان موجوں کے استقبال کی صلاحیت ہو ان تمام موجوں کو جمع و آشکار کرنا ممکن ہے، اسی لئے علمی نکتۂ نظر سے طاقت کا مادہ کی صورت میں بدل جانا ممکن ہے اور ہمارے اعمال و اقوال کا مادی موجودات کی صورت میں مجسم ہونا بھی ممکن ہے۔ لہٰذا اس قسم کی چیزوں کو محال نہیں کہا جا سکتا۔

ایک اور اعتبار سے زمانہ چونکہ نسبی شئے ہے یعنی سورج کے گرد زمین کی حرکت سے پیدا ہونے والی شئے ہے اب اگر ہمارے لئے آسمانی کرات میں سے کسی کرہ کی طرف سفر ممکن ہو جائے تو زمین پر ہونے والے تمام حوادث کو ان کے تمام خصوصیات کے ساتھ ہزاروں سال کے بعد بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ پس ہم وہاں پہ اپنے ان اعمال کا بھی مشاہدہ کر سکتے ہیں جو مدتوں پہلے سرزد ہو چکے ہیں کیونکہ وہ اعمال اس کرہ تک ایک طویل مدت کے بعد ہی پہنچتے ہیں۔

آج بھی بعض روشن ستاروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کافی روشن ہیں حالانکہ کئی قرنوں پہلے وہ ٹوٹ چکے ہیں اور ان کا کوئی خاص اثر باقی نہیں ہے، اس کے باوجود چونکہ اس ستارے اور زمین کے درمیان کافی فاصلہ ہے، اس لئے ہم ان کو روشن و تابناک دیکھتے ہیں۔

پس زمانہ کے نسبی ہونے کی وجہ سے انسان ان اعمال کو دیکھ سکتا ہے جو ماضی میں رونما ہوئے

تھے اور نسیان کے گرد و غبار میں پوشیدہ ہو گئے تھے۔

اور چونکہ انسانی حواس اشیاء کے ظاہر تک ہی پہنچتے ہیں باطن اشیاء تک نفوذ نہیں کر سکتے اس لئے انسان اس دنیا میں اپنے اعمال کے ریکارڈ کی کیفیت کو دیکھ نہیں سکتا کہ آیا وہ اس کے لئے مفید ہیں یا مضر! لیکن آخرت میں چونکہ ہر مخفی چیز منکشف ہو جائے گی اور پوشیدہ چیز واضح ہو جائے گی اور ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا اس لئے ہر عمل کو اس میں واضح و منکشف دیکھے گا۔

قرآن مجید جو حقیقت کا کاشف اور واقع کا بیان کرنے والا ہے اس کی آیات قیامت کے حوادث کو بیان کر رہی ہیں، ارشاد ہوتا ہے: بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ (سورہ انعام آیت ۲۸) بلکہ جو (بے ایمان) پہلے سے چھپاتے تھے آج (اس کی حقیقت) ان پر کھل گئی ہے۔

پس وہ مجرمین جو اپنی نفسانی خواہش اور شہوتوں میں گرفتار ہیں وہ اپنے ضمیر کو دھوکہ دینے کے لئے اپنے نفوس سے ان امور کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے لئے مضر ہیں مگر یہ چھپے ہوئے حقائق قیامت میں واضح ہو جائیں گے۔

اسی طرح ارشاد ہے: وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنشُورًا اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (سورہ اسراء[1] آیت ۱۳، ۱۴) اور ہم نے ہر آدمی کے نامۂ عمل کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے (کہ اس کی قسمت اس کے ساتھ رہے) اور قیامت کے دن ہم اسے اس کے سامنے نکال کر رکھ دیں گے کہ وہ اس کو ایک کھلی ہوئی کتاب اپنے روبرو پائے گا۔

---

[1] : اس کو سورۂ بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں۔ مترجم

(اور ہم اس سے کہیں گے کہ) اپنا نامۂ عمل پڑھ لے اور آج اپنا حساب لینے کے لئے تو خود ہی کافی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے: يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۔ (سورۃ القیامۃ، آیت ۱۳) اس دن آدمی کو جو کچھ اس نے آگے پیچھے کیا ہے بتا دیا جائیگا۔

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے اِقْرَأْ كِتَابَكَ .... الخ کے بارے میں پوچھا تو حضرت نے فرمایا، انسان کو اس کے تمام اعمال یاد دلائے جائیں گے گویا کہ اس نے اسی وقت اس کو انجام دیا ہے اسی لئے یہ گنہگار لوگ کہیں گے، وائے افسوس یہ کیسی کتاب ہے اس نے تو چھوٹے بڑے ہر عمل کا احصا کر رکھا ہے۔[1]

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کتاب کی حقیقت اور اس کے پڑھنے کی کیفیت دنیاوی کتابوں سے الگ ہوگی اور قیامت میں یہ ایک قسم کا تذکرہ ہے۔

یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اعمال کے ریکارڈ کا مطلب یہ ہے کہ تمام وہ اعمال جنکو انسان خود بجا لایا ہے اور اس کے افعال پر جو نتائج و آثار مرتب ہوں گے وہ سب اس کے نامۂ عمل میں اور ان سب پر محاسبہ کیا جائے گا اسی لئے قرآن نے کہا ہے: إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ ۔ (سورۃ یٰس آیت ۱۲) ہم یقیناً مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ لوگ پہلے کر چکے ہیں (ان کو) اور ان کی (اچھی یا بری باقی ماندہ) نشانیوں کو لکھتے جاتے ہیں۔

ان حساس لمحات میں جب مجرمین کی نظریں اپنے ان اعمال پر پڑیں گی جن کو وہ ماضی میں کر چکے ہیں تو وہ بڑی حیرت و تعجب سے کہیں گے: يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۔ (سورۃ کہف آیت ۴۹) ہائے ہماری شامت یہ کیسی

---

[1] تفسیر عیاشی ج ۲ ص ۲۴۲ منقول از بحار ج ۳ ص ۲۴۲

کتاب ہے کہ نہ چھوٹے گناہ کو بغیر قلمبند کئے چھوڑتی ہے نہ بڑے گناہ کو اور جو کچھ ان لوگوں نے (دنیا میں) کیا تھا وہ سب (لکھا ہوا) پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ کرے گا۔

یا پھر ہر ایک کہے گا، یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا (س فرقان آیت ۲۸) ہائے افسوس کاش میں فلاں شخص کو (اپنا) دوست نہ بناتا۔ لیکن مجرموں کی اس طرح سے معافی مانگنا انکو ان کے عذاب سے بچا نہیں سکتا۔ ایک جگہ پر قرآن مجید مجرموں کی ندامت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ـــــ (فرقان آیت ۲۷) ـــــ اور جس دن ظلم کرنے والا ہاتھ (مارے افسوس کے) کاٹنے لگے گا اور کہے گا کاش رسولؐ کے ساتھ میں بھی (دین کا سیدھا) راستہ پکڑتا ـــــ لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِیْ ؕ وَ کَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (س فرقان آیت ۲۹) بیشک اس نے ہمارے پاس نصیحت آنے کے بعد مجھے بہکایا اور شیطان تو انسان کو رسوا کرنے والا ہے ہی۔

یہ لوگ اپنی براءت ثابت کرنے کے لئے شیطان کی ملامت کرنے لگیں گے لیکن محاذ ملامت اس کی تردید کریں گے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے: وَ قَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَکُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَ وَعَدْتُّکُمْ فَاَخْلَفْتُکُمْ ؕ وَ مَا کَانَ لِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَکُمْ (س ابراهیم آیت ۲۲) اور جب (لوگوں کا آخری) فیصلہ ہو چکے گا (اور لوگ شیطان کو الزام دیں گے) تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا (وہ تو پورا ہو گیا) اور میں نے بھی وعدہ کیا تھا مگر میں نے وعدہ خلافی کی اور مجھے کچھ تم پر حکومت تو تھی نہیں مگر اتنی بات تھی کہ میں نے تم کو (برے کاموں کی طرف) بلایا اور تم نے میرا کہنا مان لیا تو اب تم مجھے برا بھلا نہ کہو بلکہ (اگر کہنا ہے تو) اپنے نفس کو برا کہو۔

اور چونکہ کسی بھی چیز کی واقعی قدر و قیمت اس کی ضد سے پہچانی جاتی ہے اس لئے قرآن جنت، اصحاب جنت کی سعادت اور ان کی خوشنودی جو شکر سے بھرپور ہے اس کا ذکر اصحاب جہنم کی مصیبت اور ان کی دنیا کی طرف لوٹا دیئے جانے کی خواہش کو رد کئے جانے کے مقابلے میں کرتا ہے اور مستقبل بعید میں ہونے والے واقعات کی تصویر کشی کرتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف منظر پیش کرتا ہے: (۱) جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَ لِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۞ وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْۤ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۞ الَّذِيْۤ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۔

(۲) وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ۞ وَ هُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَاۤ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ اَوَ لَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَ جَآءَكُمُ النَّذِيْرُ ؕ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۔ (س فاطر آیت ۳۳ تا ۳۷) (اور اس کا صلہ) بہشت کے سدا بہار باغات ہیں جن میں یہ لوگ داخل ہوں گے اور انہیں وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور وہاں ان کی (معمولی) پوشاک خالص ریشمی ہوگی اور یہ لوگ (خوشی کے لہجے میں) کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے "ہر قسم کا" رنج و غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار بڑا بخشنے والا (اور) قدر والا ہے جس نے ہم کو اپنے فضل (و کرم) سے ہمیشگی کے گھر (بہشت) میں اتارا (مہمان کیا) جہاں ہمیں کوئی تکلیف چھوئے گی بھی نہیں اور نہ کوئی تکان پہنچے گی۔

(۲) اور جو لوگ کافر ہو بیٹھے ان کے لئے جہنم کی آگ ہے نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ وہ مر جائیں (اور تکلیف سے نجات ملے) اور نہ اُن سے ان کے عذاب ہی میں تخفیف کی جائے گی، ہم ہر ناشکرے کی سزا یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہ لوگ دوزخ میں (پڑے) چلایا کریں گے کہ پروردگارا اب ہم کو (یہاں سے) نکال دے تو جو کچھ ہم کرتے تھے اسے چھوڑ کر نیک کام کریں گے (تو خدا جواب دیگا کہ) کیا ہم نے تمہیں اتنی عمریں نہ دی تھیں کہ جن میں جس کو جو کچھ سوچنا سمجھنا (منظور) ہو خوب سوچ سمجھ لے اور (اس کے علاوہ) تمہارے پاس (ہمارا) ڈرانے والا (پیغمبر) بھی پہنچ گیا تھا تو (اپنے کئے کا مزا) چکھو۔ کیونکہ سرکش لوگوں کا کوئی مددگار نہیں۔

نمبرا والی آیات جنت کی دائمی و مستقر وضع پر دلالت کرتی ہیں جہاں پر متقی اور سعید لوگ بغیر حساب مادی اور معنوی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہوں گے۔ ان کی مادی خواہشات پوری ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ سعادت اور اطمینانِ نفس اور معنوی و روحی لذات حاصل ہونگی اسی لئے اصحاب جنت کی زبانیں سعادتِ ابدی حاصل ہونے کی وجہ سے اور مقرِ اطمینان میں داخل ہو جانے کے سبب خدا کا شکر ادا کرتی رہیں گی اور وہ لوگ خدا کا اس بات پر بھی شکر ادا کرتے رہیں گے کہ اس نے اعمال صالحہ کے بدلے میں ایسی جوار رحمت فرمائی اور عالم جنان کو فرح و رضوان سے مملو کر دیا ہے اور یہ ایسا عالم ہے کہ جہاں ادنیٰ الم و عدم استقرار کا گزر بھی نہیں ہے اور یہ ساری نعمات اس کی عنایات کا جزو ہیں ورنہ وہ لوگ تو سیلاب کی طرح آنے والی نعمتوں کا اپنے کو اہل بھی نہیں سمجھتے۔

اور اگر ہم دوسری طرف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ غم و اضطراب مفسدین و منحرفین پر غالب ہے کیونکہ ان کی بازگشت سزا شدید کی طرف ہے۔ لہٰذا اصحاب جہنم شدتِ رسوائی اور بدبختی کی وجہ سے دردناک آوازوں کے ساتھ اپنی ذلت و رسوائی پر روتے رہتے ہوں گے اور چاہتے ہوں گے کہ اس ہلاکت سے نکل کر دنیا کی طرف آ جائیں تاکہ اپنے فاسد اعمال کا

جبران کر سکیں۔

لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ زندگانی دنیا ختم ہو چکی ہے لہٰذا یہ امید فائدہ بخش نہیں ہے۔ بس وہ لوگ ایک سیکنڈ کے لئے بھی ہولناک عذاب جہنم سے نجات نہ پا سکیں گے اور نہ موت آئے گی کہ ان کو راحت و آرام مل سکے۔

یہاں دونوں گروہوں کی حالت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک طرف سعادت و راحت ہے اور دوسری طرف عذاب، الم، بدبختی، شقاوت، ندامت و ختم ہونے والی ذلت ہے۔

قیس بن عاصم کا بیان ہے: کہ میں دوسرے ایک وفد کے ساتھ میں مدینہ وارد ہوا جب ہماری ملاقات رسول خدا ؐ سے ہوئی تو ہم نے خواہش کی کہ کچھ وعظ و نصیحت فرمایئے! میں نے عرض کی حضور ہم اہل بادیہ ہیں ہمارا شہر میں آنا بہت کم ہوتا ہے اس لئے ہم اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہیں اور آپ کی شیریں بیانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں! سرکار نے فرمایا: عزت کے ساتھ ذلت ہے اور یقیناً موت زندگی کے ساتھ ہے، ہر شئے کا حساب ہوگا اور ہر چیز پر نگراں موجود ہے۔ ہر نیکی کا ثواب ہے اور ہر برائی پر سزا، ہر مدت ختم ہونے والی ہے اور اے قیس تمہارے ساتھ ایک تمہارے ہم نشین کا دفن ہونا ضروری ہے جو زندہ ہوگا اور تمہارا اس کے ساتھ دفن ہونا ضروری ہے اس حالت میں کہ تم مردہ ہوگے اگر وہ ہم نشین کریم ہے تو تمہارا اکرام کرے گا اور اگر لئیم ہے تو تم کو مصائب کے حوالے کر دے گا، پھر اس کا حشر بھی تمہارے ساتھ ہوگا اور تم بھی اس کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے اور تم سے صرف اسی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ لہٰذا تم اس کو صالح قرار دو اگر وہ صالح ہے تو تم اس سے مانوس ہوگے۔ اور اگر وہ فاسد ہے تو تم اس سے متوحش ہوگے اور وہ تمہارے اعمال ہیں۔[۱]

---

[۱] امالی الصدوق ـ ص ۳

خلود (بقاء) کا مشکل مسئلہ کیونکر حل ہو؟

بہت سے لوگوں کی نظر میں سب سے زیادہ مشکل مسئلہ "منفسدین کا دائمی عذاب" اور منکرین کے لئے "بصورت استمرار عذاب جہنم" ہے۔ کیونکہ یہ لوگ غیر متناہی زمانہ تک عذاب الیم برداشت کریں گے۔

اس مشکل اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی مدت چاہے کتنی طویل ہو بہر حال محدود ہے پھر اس میں کئے جانے والے محدود اعمال کا نتیجہ غیر محدود عذاب کیونکر ہو سکتا ہے؟ یا مختصر عبارت میں یہ کہا جائے: دنیا کے محدود عمل اور آخرت میں اس کی غیر محدود جزاء کے درمیان کون سا علاقہ موجود ہے؟

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ اگر عمل کا عقاب مستقبل میں ایک ایسے زمانے تک ہو جس کی کوئی انتہا نہیں ہے تو محض اس بات کا تصور کر کے دلوں پر رعب اور جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے ـــــــ حالانکہ بشری قانون اور جزائی مقررات میں یہ بات مسلّم ہے کہ محدود قانون کی مخالفت کرنے والے کی جزاء اس کے جرم کے لحاظ سے ہوا کرتی ہے۔ یہ نزدہ ہے کہ بعض سزاؤں کی مدت طویل اور بعض کی مختصر ہوا کرتی ہے، کیونکہ انسان جو قانون کی مخالفت کرتا ہے وہ مخالفت کمیت و کیفیت کے اعتبار سے مساوی نہیں ہوتی اس لئے عقاب کا تمام حالات میں مساوی و مشابہ ہونا ناممکن ہے۔

لیکن جب ہم الٰہی ملک کو دیکھتے ہیں جہاں خالص انصاف ہی انصاف ہے جہاں معمولی عمل بھی بے جزاء نہیں ہوتا اور نہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا محاسبہ نہ کیا جائے بلکہ ہر عمل صالح چاہے وہ ذرہ برابر ہو اس پر ثواب ملے گا اور کوئی مجرم سزا سے نہیں بچ سکتا۔ البتہ اگر کسی پر رحم و کرم

پروردگارِ عالم ہو جائے تو دوسری بات ہے۔ جب یہ صورتحال ہے تو اس عادل نظام میں انسانی عمل اور اس کے عقاب میں کسی دقیق تناسب کی رعایت نہ کی جائے یہ ایک ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے!

اب رہی یہ بات کہ اصحاب جنت پر اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا؟ کیونکہ وہاں بھی دنیا وی عمل خیر پر ابدی جنت ہے یعنی عمل خیر کیسا ہی ہو بہر حال محدود ہوگا پھر اس کی جزا غیر محدود کیونکر ہو سکتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں اعتراض الگ الگ ہیں دونوں کی بنیاد ایک نہیں ہے دونوں میں بڑا تفاوت اور واضح فرق ہے کیونکہ ثواب اور جزا کا تعلق ایک افق سے ہے اور عقاب و سزا کا تعلق دوسرے افق سے ہے۔ ثواب چاہے جتنا زیادہ ہو وہ ثواب دینے والے کے فضل و کرم پر موقوف ہے۔

اس لئے صرف یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ مومنین کے علاوہ دوسرے گنہگاروں کو ابدالآباد تک ایک سیکنڈ کی تخفیف کے بغیر مسلسل عذاب کیا جا سکے گا اور یہ غیر محدود عقاب اس محدود فساد و گناہ سے مناسبت نہیں رکھتا جس کو ان گنہگاروں نے اپنی دنیاوی زندگی میں کیا ہے بلکہ اگر گناہ گاروں کی پوری زندگی گناہوں سے بھر پور ہو جب بھی وہ ایک قرن سے زیادہ نہ ہوگی حالانکہ عقاب ابدی و دائمی ہوگا اور اس ایک قرن گناہ کی نسبت دائمی و ابدی عقاب کے مقابلہ میں ایک سیکنڈ سے زیادہ نہیں ہے۔

بعض علماء نے ان آیات کی تاویل کی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ مجرمین دائمی عذاب میں رہیں گے اور وہ تاویل یہ ہے کہ خلود سے مراد مجازی طور پر طویل مدت ہے نہ کہ ابدالآباد! اور ان علماء کا خیال ہے کہ اس سے جواب ہو گیا ——— لیکن یہ جواب حقیقت امر سے بعید ہونے کے ساتھ ساتھ درست بھی نہیں ہے اور اس کے علاوہ اس تاویل پر کوئی معقول دلیل بھی قائم نہیں ہے اور یہ بات تو واضح ہے کہ تاویل وہاں ہوتی ہے جہاں پر آیات صریحہ سے تعارض نہ ہوا ہو ورنہ نص صریح کے مخالف ہوگی اس کو رد کر دیا جائے گا اور قرآن خلود و دوام کی صریح طریقے

مجرمین کے لئے اعلان کرتا ہے۔ اس لئے ان تاویلات کی قرآن شدت سے مخالفت کرتا ہے اور ببانگ دہل اعلان کرتا ہے: اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ (س توبہ آیت ۶۳) کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو خدا اور رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے تو اس کے لئے تو دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ (ہمیشہ) رہے گا اور یہی تو سب سے بڑی رسوائی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ (س ھود آیت ۱۶) یہ وہی لوگ ہیں کہ آخرت میں جہنم کے سوا ان کے لئے کچھ نہیں ہے۔

تیسری جگہ اعلان ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (س بقرہ آیت ۳۹) جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

چوتھی جگہ اعلان ہوتا ہے: وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (س بقرہ آیت ۲۱۷) اور تم میں جو دین سے پھر جائے اور کفر کی حالت میں مر جائے اس کے تمام دینی و دنیاوی اعمال اکارت جائیں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں۔ اور یہ ہمیشہ (ہمیشہ) جہنم میں رہیں گے۔

ان آیات کی صراحت و وضاحت کا نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی خلود کی تاویل یا تاویل بعید کی جاسکتی ہے۔ یہ آیتیں علی الاعلان کہہ رہی ہیں کہ کفار ہمیشہ (ہمیشہ) جہنم میں رہیں گے اور نجات کے تمام راستے ان کے لئے مسدود ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ کفار کے لئے خلود فی النار ہے اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

اب رہا گنہگاروں کا معاملہ ــــــــ یعنی جو مومن ہیں مگر گنہگار ہیں مترجم ــــــــ

قوان کے سلئے عقاب کا گناہ کے مطابق ہونا ضروری ہے یعنی ان کا عقاب گناہ کے متناسب کیا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ رحم وکرم وعفو پروردگار ان کو معاف بھی کر دے۔
یاد رکھیئے خدائے عادل کے عقاب کا خوف بہت سے لوگوں کو اوامر الٰہی کا پابند بنادیتا ہے۔ اور دینی عوامل واسباب جو انسان کے اختیار میں ہیں، طاقت وقوت کے استعمال کی بہ نسبت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ جو آدمی قدرت الٰہی سے واقعی طور سے خائف ہوگا اس کا معاشرہ اس کی طرف سے مطمئن ہو جائے گا کہ اس شخص سے جرم وزیادتی نہیں ہوگی۔ لہٰذا دینی اسلحہ سے مسلح ہونا بہت بڑا محافظ ہے اور دینی تربیت جتنی کم ہوگی جرائم کی اتنی کثرت ہوگی۔

اور خدائے عادل کے عقاب سے خوف کے برعکس جو خوف ہوتا ہے وہ مرضی اور معنز ہونے کے ساتھ ضعف وذلت کی پیداوار ہوا کرتا ہے اور صرف یہی نہیں کہ اس کی وجہ سے انسان عمل خیر سے باز رہ جاتا ہے بلکہ یہ انسان کی سعادت وترقی میں بہت بڑا مانع ہے۔ اب رہا وہ خوف جو کبھی فی التفکیر سے پیدا ہوتا ہے وہ اس سرخ روشنی کو ابھارنے والا ہے جو انسان کو گناہوں سے بچا لیتا ہے اور مختلف حالات واسباب کے ماتحت اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور واجبات کے ادا کرنے کی طرف ہدایت کرتی ہے اور وہ انسان ان حالات میں اپنی واقعی سعادت اور حقیقی کامیابی کا حریص رہتا ہے۔

اور برے اعمال کے برے نتائج سے خوف انسان کو ایک منظم ومنضبط شخصیت کا حامل بنادیتا ہے جو غور وفکر کے ذریعہ انجام میں تمیز کر لیتا ہے اور احتیاط وہوشیاری کے راستہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنے چھوٹے بڑے تمام اعمال کی بڑی دقت وامانت کے ساتھ نگرانی کرتا ہے اور ہمیشہ عظمت وسطوتِ الٰہی میں گھنٹوں غور کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے دینی تعلیم نے یہ بتایا ہے کہ انسان کو خوف وامید کی دونوں حالتوں میں متقلب رہنا چاہیئے۔ لیکن یہی

حالت میں کہ جب وہ خداوند عالم کے غیر متناہی فضل و کرم کا امیدوار ہو اس کے ساتھ ساتھ اپنے اعمال کے نتائج کے بارے میں بھی سوچتا رہے تاکہ دھوکہ و غلط فہمی میں نہ پڑ سکے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: خوف دل کا رقیب ہے اور امید نفس کا شفیع ہے۔ جو شخص عارف باللہ ہوگا وہ خدا سے خائف اور اس کا امیدوار بھی ہوگا۔ خوف و رجاء ایمان کے دو بازو ہیں جن کے ذریعے سچا بندہ رحمت الٰہی کی طرف پرواز کرتا ہے اور یہ دونوں ——— خوف و رجاء ——— عقل انسانی کی آنکھیں ہیں جن کے ذریعے بندہ وعدہ وعید الٰہی کو دیکھتا ہے خوفِ وعید عدل الٰہی کا طالع ہے اور رجاء فضل الٰہی کی دعوت دینے والی ہے۔ رجاء انسان کو حیات بخشتا ہے اور خوف نفس کو مار دیتا ہے۔ سرکار رسالتمآب نے فرمایا: مومن دو خوفوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے ماضی کا خوف اور مستقبل کا خوف اور جب نفس مر جاتا ہے تو دل زندہ ہو جاتا ہے تو بلوغ الی الاستقامت نصیب ہوتی ہے۔ جو شخص خدا کی عبادت میزانِ خوف و رجاء کے مطابق کرے وہ نہ تو کبھی گمراہ ہوگا اور نہ کبھی حصولِ مقصد میں ناکام ہوگا۔

امام جعفر صادقؑ ذکر موت کے ایجابی پہلو کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: موت کا ذکر نفسانی خواہشات کو مار دیتا ہے۔ غفلت کے سرچشمہ کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ وعدہ ہائے الٰہی سے دل کو قوت دیتا ہے، طبیعت میں نرمی پیدا کرتا ہے۔ خواہشات کے جھنڈوں کو توڑ دیتا ہے، حرص کی آگ کو بجھا دیتا ہے اور رسول خداؐ کی اس حدیث ——— فِکْرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَنَةٍ ——— "ایک گھنٹہ تفکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے" کا مطلب بھی یہی ہے۔

اور ہر وقت امور دنیا میں ڈوبے رہنا غفلت و لاپرواہی کا ایک بہت ہی دبیز پردہ انسان کی بصیرت کے سامنے ڈال دیتا ہے اور اس کو معنوی قدر و قیمت سے گرا دیتا ہے اور آخر کار خالی ہاتھ مر جاتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ بازار بصرہ میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ اپنے سے بالکل غافل ہیں اور خرید و فروخت میں اس طرح مشغول ہیں کہ گویا نہ تو موت اور نہ بعث و نشر ان کے انتظار میں ہے۔ یہ حال دیکھ کر حضرت علیؑ اتنا متاثر ہوئے کہ چیخ مار کر رونے لگے۔ اس کے بعد فرمایا: اے دنیا کے بندو! اور اہل دنیا کے غلامو! جب تم دن میں اس طرح خدا کی قسم کھاتے ہو اور راتوں کو اپنے بستروں میں سو جاتے ہو اور ان دونوں کے درمیان آخرت سے غافل رہتے ہو تو تم زاد راہ کب مہیا کرو گے؟ اور معاد کے بارے میں کب غور کرو گے؟[1]

امام زین العابدینؑ خدا سے مناجات کرتے ہوئے فرماتے ہیں: خدایا مجھے ایسی زندگی دے جسے میں تیری عبادت میں صرف کروں اور اگر میری عمر شیطان کی چراگاہ بننے والی ہو تو اپنی ناراضگی سے پہلے اور میرے اوپر اپنا غضب مستحکم کرنے سے پہلے مجھے موت دے دے۔[2]

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ انسان اس دنیا سے متعلق ہے یعنی دنیا کے بہت سے لذائذ و سعادتوں سے وابستہ ہے بلکہ عام لوگوں میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان امور کو حاصل کر لیں اور یہ خواہش محدود افراد میں نہیں بلکہ سب ہی میں (تقریباً) ہے اور یہ خواہشات موت سے پہلے ختم بھی نہیں ہوتیں ـــــــ اس لئے خداوند عالم نے پاک و پاکیزہ لذتوں سے بہرہ یاب ہونے کو روکا بھی نہیں اور بالکلیۃً دنیا اور لذات دنیا سے منع بھی نہیں فرمایا البتہ چونکہ مجبوراً اور عیر دائمی قدر و قیمت (آخرت میں) واقعی قدر و قیمت اور حقیقی امیدوں کی طرف پلٹا دی جائیں گی۔ اس لئے بندوں کو ڈرایا ہے کہ وقتی لذتیں ان کو دھوکہ دیں اور عارضی خواہشات میں اپنے کو گرفتار کر کے دائمی نعمتوں سے محروم نہ ہو جائیں اور لوگوں کو ہمیشہ

۱۔ سفینۃ البحار ج ۱ ص ۴۷۳

۲۔ صحیفہ سجادیہ کی دعائے مکارم الاخلاق (ص ۱۰۲)

اس بات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ رضائے الٰہی کے طالب اور اطاعتِ الٰہی پر چلیں رہیں۔

آئیے اب ذرا یہ بھی دیکھیں کہ مجرمین، سرکشوں، ملحدوں کو عذاب ابدی میں مبتلا کرنے سے آخر یہ مساوات کیونکر ہوتی ہے؟ اور یہ عمل ذات ازلی کی عدالت سے بھلا کیونکر بعید ہے؟ اگر ہم اس موضوع کو دقتِ نظر کے ساتھ دیکھیں تو پتہ چل جائے گا کہ عجلہ بازی میں جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے درست نہیں ہے کیونکہ اس نتیجہ کی بنیاد جس چیز پر رکھی گئی ہے وہی ناقص ہے۔ اس نتیجہ کی بنیاد اس تصور پر قائم کی گئی ہے کہ آخرت کا عقاب ایک اعتباری سزا و جزا کی بنا پر ہوگا جس پر تمام قانون دان حضرات متفق ہیں اور جو عقاب کا دارومدار جرم کی شدت و وسعت پر رکھتے ہیں لہٰذا ان کی نظر میں دنیا میں کئے گئے جرائم کی سزا آخرت میں عقاب دائمی کی صورت میں نامناسب معلوم ہوتی ہے اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ ان دونوں کے درمیان طبعی و تکوینی علاقہ موجود ہے اور عقاب عمل کا اثر و نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ یہ کوئی اعتباری و فرضی چیز نہیں ہے تو یہ اعتراض بہت آسانی کے ساتھ حل ہو جائے گا۔

قیامت کے دن تکلیف و عقاب عمل کا خاصہ ہے ــــ جو عمل سے جدا نہیں ہو سکتا ــــ لہٰذا اعمال کے جو فطری و طبعی نتائج ہیں وہ بہرحال آخرت میں کفار و مجرمین پر مرتب ہوں گے۔ اور قرآن مجید اس راز سے پردہ ہٹاتے ہوئے کہتا ہے: وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (س جاثیہ آیت ۳۳) اور جو کچھ وہ کیا کرتے تھے اس کی برائی ان پر ظاہر ہو گئی اور جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اسی چیز نے ان کو گھیرا، اسی طرح ارشاد ہے: وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (س کہف آیت ۴۹) انہوں نے جو کچھ دنیا میں عمل کیا تھا اُسے موجود پایا۔ تمہارا خدا کسی پر (بھی) ظلم نہیں کرتا۔

ان آیات میں وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ لوگ قیامت کے دن اپنے اعمال کو حاضر و موجود پائیں گے یعنی انسانی عمل کی صورت اس کے سامنے اخروی شکل و صورت کی صورت میں موجود ہوگی۔ اور ہمارے تصورات کے برخلاف "کہ ہمارا عمل تو ایک وقتی اور گزر جانے والی چیز ہے" ہم اپنے بعض اعمال کو اتنا ثقیل پائیں گے کہ وہ ابعاد مستی وہ بلکہ جاوید ہو گا ہمہ۔

اب ہم کچھ مثالیں پہلے ذکر کر رہے ہیں تاکہ قاری کا ذہن اس حقیقت کے ادراک کے لئے آمادہ ہو جائے اور ہم جو بات کہنا چاہتے ہیں اس کی وضاحت ہو جائے اور مسئلہ آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکے۔

آپ تھوڑی دیر کے لئے فرض کریں کہ ایک ایسا انسان موجود ہے جس پر منفی روح کا غلبہ ہے اور وہ انسان دنیا کو نحوست سے بھرپور خیال کرتا ہے تو اس کے لئے یہ دنیا قلق و اضطراب سے پُر نظر آئے گی۔ اور بجائے اس کے فطرت کی عظمت اس کی روح میں سعادت، لذت اور اطمینان کا احساس دلا سکے۔ اس کا دل پریشان ہوگا اس کے تمام وجود پر رنج و غم کے بادل چھائے ہوں گے اور یہ شخص اپنے اس نظریہ کی وجہ سے پورے عالم کو تیرہ و تار دیکھے گا اور ہمیشہ رنجیدہ رہے گا اور اس عذاب سے چھٹکارا نہیں پا سکے گا۔ اگرچہ یہ دنیا لطف و ابلاغ کی بے مثال نمونہ ہو اس کی خوبصورتی دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی ہو مگر یہ شخص اس کے باوجود رنجیدہ رہے گا اور یہ ایک ایسا غم ہے جو اس کے نفس کو عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ مایوسیوں، ناامیدیوں کے شکار رہا کرتے ہیں اور ان کا غم اندھے سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اندھا تو اپنی محرومی کی وجہ سے دنیا کی خوبصورتی دیکھنے سے معذور ہے اور رنجیدہ ہے مگر یہ شخص آنکھوں کے باوجود اشتداد وجود اور وسعت وجود کے عذاب سے بلاتی، اضطراب الم، بدبختی کا شکار رہے گا۔ اور ایسے شخص کی روح حالانکہ وہ ایک ہے لیکن چونکہ تمام ظواہر عالم اور اس کے حوادث پیش نظر ہیں اس لئے وہ غیر متناہی نکبت بدبختی ہے اور اس کے

سامنے قباحت، بدبختی، برائی کے اتنے وحدات جمع ہو جاتے ہیں جن کا شمار نہیں ــــــ اسی طرح آخرت میں بھی ممکن ہے مترجم ــــــ

ایک اور مثال: اگر کوئی شخص انسان کے لئے بے دینی کا پل اور راستہ بنا جاتا ہے۔ تو جتنے لوگ اس کے واسطہ سے گمراہ ہوں گے اور جتنے گناہوں کا ارتکاب کیا جائے وہ حقیقت اسی پہلے عمل کا نتیجہ شمار کیا جائے گا گویا اس شخص نے اپنا ایک ایسا اثر چھوڑا ہے جو ختم ہونیوالا نہیں ہے اور مدت بعید تک مستمر رہنے والا ہے اور اس گمراہی و فساد کے تمام سلسلے ایک شخص تک منتہی ہوتے ہیں اور مستقبل بعید میں اپنے دوران کے بعد نقطۂ ابتدا کی طرف پلٹ آئیں گے۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ: اگر کسی بندۂ خدا نے گمراہی کا راستہ ایجاد کیا تو جتنے اس راستہ پر چلنے والے ہیں سب کے گناہ اس بندے کے نام لکھے جائیں گے اور گناہ کرنے والوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔[۱] اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان سے جو عمل سرزد ہوتا ہے وہ متعدد اعمال کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔ اور ہر انسان کے عمل کی تاثیر جو عالم انسانی پر ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ عالم غیب پر بھی اس کا ایک خاص اور گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ عمل امواج جاذبہ یا امواج طاردہ کی ایک دنیا پیدا کر دیتا ہے جب اگر وہ عمل سلبی اور ردی ہوا تو تمام عالم غیب کے اطراف و جوانب اس کو رد کریں گے اور دفع کریں گے۔ اسی طرح اگر وہ عمل ایجابی اور محبوب ہوا ہو تو عالم غیب کے اطراف و جوانب اسکو اپنی طرف کھینچیں گے۔

اور سب سے بڑی غلطی یہ طرز فکر ہے کہ فاسد عمل اور اس کے جزا میں زمانی رابطہ ہونا چاہئیے

---

[۱] : سفینۃ البحار ج ۱ ص ۶۶۵

کیونکہ زمانہ جزاء کیفیت عصیان وگناہ کے متناسب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا چاہے عمل فاسد ہو یا صالح اور اخروی ثواب وعقاب کے درمیان ایک قسم کا ارتباط واقعی ہونا ضروری ہے۔ حالانکہ زمانہ کی مقدار یہاں پر علی الاطلاق منظور نہیں ہے۔ اور جب یہ طے شدہ بات ہے کہ اگر جزاء وسزا نفس عمل کا براہ راست نتیجہ ہوں گے تو کوئی بھی متعلق مقدار وکیفیت کے لحاظ سے اصل مساوات کا قائل ہو ہی نہیں سکتا۔ پہلے ہم ایک مثال پیش کر دیں جس سے ذہن آخری نتیجہ کے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ عالم خارجی ہمارے اعمال کے مقابلہ میں رد عمل کا اظہار کرتا ہے اور جو لوگ اپنے اعمال کی آگ میں جلتے ہیں وہ اس قانون کے مصادیق ہیں۔

فرض کیجئے ایک جوان کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ وہ ہوا میں چھلانگ لگائے چنانچہ اس نے اپنے مقصد کے حصول اور ذہنی خواہش کی تکمیل کے لئے چھت پر چڑھ کر چھلانگ لگا دی جس کے نتیجے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپاہج ہو جاتا ہے —————
اب یہ جوان تمام عمر اپنے پاؤں سے نہیں چل سکتا اور اس کی پوری زندگی ایک عذاب بن گئی۔

اب سوچیئے کہ خطا وغلطی کی مدت کتنی کم ہے؟ چھت سے زمین تک آنے میں چند سیکنڈ سے زیادہ کا وقت درکار نہیں ہوتا لیکن اس کی سزا (مثلاً) پچاس سال تک بھگتنا پڑی اور مرتے وقت تک وہ اپاہج ہی رہا پھر آخر گناہ کی مدت اور سزا کی مدت میں مساوات کا قانون کہاں گیا؟

اور کسی انسان کا اونچی چھت سے گرنا اور ان تکلیف دہ آثار میں مبتلا ہونا یقینی طور پر کو جاتا ہے کہ ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے اوپر کیونکر پلٹتے ہیں اور یہاں قیدوں کا ایک نمونہ ہے جس کو ہمارے اعمال ہمارے لئے بناتے ہیں اور یہ بمنزلہ خطوط پیشانی ہیں جن کو ہمارے اعمال نے تحریر کیا ہے؟

اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا یہ چھت سے کودنے کی خواہش والا لمحہ اور کیا یہ ناپسندیدہ

عمل اور تمام عمر کی بیکاری کی صورت میں ظاہر ہونے والے نتیجے میں عدم مساوات کیا یہ اصل عدالت کے منافی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! اور کیا یہ نتیجہ عمل جس میں مقدارِ عمل اور اس کے نتیجے کے مابین کسی مناسبت و مساوات کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے اصولِ عدالت کے منافی ہے؟

یقیناً یہ پچاس سال (جو ایک معمولی سی غلطی کی بناء پر بیکار ہو گئے بلکہ اگر وہ ہزاروں سال زندہ رہتا جب بھی اس غلطی کی وجہ سے تمام عمر عذاب و الم میں گزارتا) اس کے حق میں منافی عدالت نہیں ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ گناہ و نافرمانی اور عقاب کے درمیان کا علاقہ نہ تو اس دنیا میں اور نہ ہی دوسری دنیا میں زمانی علاقہ ہرگز نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ قتل جیسا ایک گناہِ کبیرہ کبھی اپنے اندر ایسا ایٹم بم رکھتا ہے کہ جو اگر چاہے تو انسان کو اپنے آتشِ انفجار میں متواتر جلاتا رہے۔

لہٰذا وہ انسان جو جان بوجھ کر احکامِ الٰہی سے روگردانی کرے گا اور اپنے نفس کو کفر والحاد اور گناہوں میں ملوث کرے گا وہ اپنے اعمال کے نتائج بھگتے گا چاہے یا نہ چاہے۔

اب رہا ثواب و عقابِ آخرت کا مسئلہ تو وہ چونکہ ہمارے حس و تجربہ سے خارج ہے۔ اسی لئے کبھی موردِ شک و تردید ہوتا ہے اور کبھی اس کا انکار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے اعمال کے نتائج دوسری دنیا میں جو ہوں گے وہ اسی کے مشابہ ہوں گے جو اس عالم میں جاری ہیں زیادہ سے زیادہ بصورت وسیع و دقیق ہوں گے۔

اس بناء پر ہمارے تمام اعمال و سلوک جو اس دنیا میں سرزد ہوتے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہوں گے کہ جن کے پیچھے ان کی جزاء و عقاب ہوگا اور وہ ہمارے سروں پر لٹکے ہوئے ایٹم بم تک خطرے کی گھنٹی بجاتے ہوں گے۔ اور ہمارے اعمال اس خاصیت کے ذریعے متمیز ہوں گے۔ یعنی ان کے عقاب کی مسئولیت ہمارے علاوہ کسی اور کے سر نہ ہوگی کیونکہ انسان

اپنی پوری زندگی آزاد رہا اور معاشرہ یا تاریخ کا کبھی اسیر نہیں بنا تو جب اس کے پورے وجود پر کفر، طغیان اور فساد کا غلبہ ہوگا اور اس نے ظلم کے لئے اپنے تمام امکانی صورتوں کو صرف کیا ہے اور ہمیشہ خواہش نفس کا غلام رہا ہے تو پھر اس کو ان اعمال کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑے گا اور وہ خمیازہ نعمات الٰہی سے دائمی حرمان کی صورت میں ہوگا۔ اور یہ بات عدل الٰہی کے منافی نہیں ہے کیونکہ خدا ظالم تو ہے نہیں لہٰذا گنہگاروں پر اس قسم کے عذاب ان کے عمل کے وضعی آثار کی بنیاد پر ہیں اور یہ ان کے اعمال کا فطری نتیجہ ہے جس طرح کہ صالح اور متقی بندے بطور دوام اپنے اعمال کے آثار و نتائج سے فائدہ حاصل کریں گے اور ان حضرات نے اپنی ذاتی کوششوں اور حسن سیرت کی وجہ سے اس دنیا میں اپنے نفوس کے لئے نفسی سعادت حاصل کر لی اور آخرت میں سعادت ابدی کے مستحق بن گئے۔

رسول اکرمؐ کی ایک مشہور روایت اس کو واضح کرتی ہے کہ فرمایا: الدنیا مزرعة الآخرة یعنی دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے جو کچھ دنیا میں کاشت کروگے اسی کو آخرت میں کاٹو گے۔

اس لئے ہر انسان کا فریضہ ہے کہ ایسا عمل کرے جس کی کوشش فراموش نہ ہو یعنی اپنے کو خواہشات نفسانی کا بندۂ بے دام نہ بنا لے۔ اس لئے ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ خواہشات کا ایسا دھواں نہ چھوڑیں جو ہمیں اندھا بنا دے اور شقاوت ابدی کے غار میں گرا دے۔

سرکار رسالتمآبؐ سے مروی ہے، خدا نے فرمایا اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو تم نے میری عیادت نہیں کی۔ اس نے کہا: خدایا تو رب العالمین ہے بھلا میں تیری عیادت کیونکر کرتا؟ جواب ملا میرا فلاں بندہ مریض تھا اگر تو نے اس کی عیادت کی ہوتی تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا پوچھے گا میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے سیراب نہ کیا۔ بندہ کہے گا یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ تو رب العالمین ہے؟ جواب ملے گا میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا اگر تو نے اس کو سیراب کیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ خدا کہے گا میں نے تجھ سے

کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا! بندہ عرض کرے گا یہ کیونکر ممکن ہے جبکہ تو رب العالمین ہے! خدا کہے گا میرے فلاں بندے نے کھانے کا سوال کیا تھا اگر تو نے کھانا کھلایا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا[۱] ۔

دیکھئے انسان کی وضع جسمی وروحی ہی محبت اور عمل صالح کا مرکز ہے۔ لیکن اگر انسان برائیوں مثلاً ظلم، تعدی کی طرف مائل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ مریض ہے اور اس نے اختیاری طور سے اپنے نفس کو گناہوں میں ملوث کیا ہے۔ جب اس بات کو سمجھ لیں گے تو یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ اس وضع سے نکلنے کے لئے انسان کے سامنے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

قرآن مجید نے گناہوں و نافرمانیوں سے نفرت اور سرکشی کو انسان کی فطری باتوں میں شمار کیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔ (سورہ حجرات آیت ۷) لیکن اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں میں زینت دے دی ہے اور کفر و نافرمانی و گناہ کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیدیا ہے لہٰذا نجات و فلاح حاصل کرنے کیلئے عدل وسعادت کے راستہ کا اختیار کرنا درحقیقت فطرت پر عمل کرنا ہے ـــــ

امام جعفر صادقؑ "خلود" کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جہنمی کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کی نیت یہ تھی کہ اگر ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے تو ہمیشہ ہی خدا کی نافرمانی کریں گے اور جنتیوں کی ہمیشہ جنت میں رہنے کی علت یہ ہے کہ ان لوگوں کی نیت دنیا میں یہ تھی کہ اگر ہم ہمیشہ دنیا میں رہیں گے تو اس کی اطاعت ہی کریں گے۔ پس دونوں کو انکی

---

[۱] : الوسائل ج ۲ ص ۲۳۶

نیّت کی وجہ سے خلود عطا کیا ہے۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۔ یعنی عَلٰى نِيَّتِهٖ ۔ (وسائل ج ۱ ص ۳۶)

یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے کہ صرف نیّت پر عقاب نہیں کیا جاتا ــــــ تو صرف نیت پر خلود کیسے؟ مترجم ــــــ لیکن درحقیقت نیّت ایک کُنجی کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ذریعے سے انسان اپنے روح کے دریچوں کو کھول سکتا ہے اور اس کے پیچھے پوشیدہ راز پر اطلاع حاصل کر سکتا ہے۔ اب اگر کسی انسان کا تمرد و فساد اس منزل تک پہنچ جائے کہ وہ مصمم ارادہ کرے کہ میں تو دائمی طور سے کفر و گناہ کا ارتکاب کروں گا تو پھر کفر و فساد اس کے وجود کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں اور خیر و فضیلت کا سرچشمہ خشک ہو جاتا ہے اور اس کے سامنے نجات کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اس لئے خلود ہے گا۔

ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیاوی نعمتوں سے استفادہ کرنا اور سعادتِ اخروی کا حاصل کرنا ان میں کوئی تضاد نہیں ہے یعنی یہ ممکن ہے کہ انسان دنیا کی تمام مباح نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور آخرت میں بھی محروم نہ رہے۔ جو چیز سعادت اخروی کے منافی ہے وہ دنیا کی عبادت کرنا اور دنیا کو ہدف بنا لینا ہے یہ بات انسان کو آخرت میں بلند درجہ تک پہنچنے سے مانع ہوا کرتی ہے۔

کیونکہ انسان کا دنیا سے عشق کرنا اور اس فانی اور غیر مستقر و گذر جانے والی دنیا میں مستغرق ہو جانا اور اس کی نعمتوں میں اپنے کو غرق کر دینا انسان کو اپنی ذات اور اپنے مقصد سے دور کر دیتا ہے اور یہ انسان غافل لاابالی بن جاتا ہے اور اس دنیاوی تعلق کا نتیجہ اس کو بلندی کی طرف حرکت سے روک دیتا ہے اور اس کو جامد بنا دیتا ہے جو اس کی شان کے قطعاً منافی ہے۔

قرآن مجید نے بھی لوگوں کو بہت ڈرایا ہے کہ خبردار دنیا کو اپنا ہدف نہ بنا لینا اور رسول اکرم کو مخاطب کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۔ عَنْ ذِكْرِنَا

وَلَمۡ يُرِدۡ اِلَّا الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ذٰلِكَ مَبۡلَغُهُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ (سورہ نجم، آیت ۲۹، ۳۰) پس جس نے ہماری یاد سے منہ پھیر لیا ہے اور سوائے زندگانی دنیا کے کسی اور چیز کا خواستگار ہی نہیں ہے تو تم بھی اس سے منہ پھیر لو ان کے علم کی انتہا یہی ہے۔

دوسری جگہ اعلان ہوتا ہے: وَفَرِحُوا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَمَا الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا فِي الۡاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ۔ (سورہ رعد آیت ۲۶) اور لوگ دنیا کی زندگانی سے راضی ہوگئے ہیں۔ حالانکہ زندگانی دنیا آخرت کے مقابلے میں سوائے ادنیٰ سرمایہ کے کچھ نہیں ہے۔

تیسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوۡا بِالۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَاطۡمَاَنُّوۡا بِهَا وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوۡنَ اُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ۔ (سورہ یونس آیت ۷، ۸) یقیناً وہ لوگ جن کو ہمارے حضور میں آنے کی امید نہیں ہے اور زندگانی دنیا پر راضی اور اسی پر مطمئن ہوگئے ہیں۔ اور وہ لوگ بھی جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔

اس نظریہ کے پیش نظر اسلام دنیا کی اہمیت کی لاپرواہی کا قائل نہیں ہے بلکہ انسانی اقدار کو زندہ کرنا چاہتا ہے اور ان تمام چیزوں کا حامی ہے جو انسان کی کرامت و اعتبار کے لائق و سزاوار ہوں۔

اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ اسلام آخرت کو ہدف و منزل آخر سمجھتا ہے۔ لیکن ترک دنیا کا بھی حامی نہیں ہے۔

حضرت علیؑ اس حقیقت کی وضاحت فرماتے ہیں:

دنیا میں عمل کرنے والے دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ ہے جو دنیا میں صرف دنیا کے لئے عمل کرتا ہے وہ اپنی دنیا میں مشغول ہونے کی وجہ سے آخرت سے لاپرواہ ہوگیا ہے۔ اپنی آنے والی نسل کے بارے میں (تو) فقیری سے ڈرتا ہے لیکن اپنے بارے میں مطمئن ہے چنانچہ وہ

اپنی پوری عمر دوسرے کی منفعت کے لئے خرچ کردیتا ہے۔

اور دوسرا وہ ہے جو دنیا میں مابعد کے لئے عمل کرتا ہے۔ لہٰذا دنیا بغیر عمل کے اسکو مل جاتی ہے اور اس نے دونوں چیزیں (دنیا وآخرت) حاصل کرلیں۔ اور دونوں گھروں کا مالک ہوگیا وہ خدا کے نزدیک وجیہہ ہوگیا۔ خدا سے جو سوال کرتا ہے خدا اس کو پورا کردیتا ہے۔[1]

آخر میں ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ حق وصدق سے وابستگی کی توفیق دے اور عمل کی توفیق دے اور اس پوری کتاب کو خالص اپنے لئے قرار دے۔

انہ ھو السمیع المجیب والحمد للہ رب العالمین

ملہ: شرح نہج البلاغہ از ڈاکٹر صبحی صالح الحکمۃ ۲۶۹ ص ۵۴۳